فروری ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر سرپرستی

امین احسن اصلاحی

مدیر مسؤل

اسرار احمد

جلد ۱۶ | فروری ۱۹۶۹ء | عدد ۲

تذکرہ و تبصرہ .... اسرار احمد - ۲

افادات ابن قیم رح ★ توکل کے مراتب و اقسام... (ترجمہ) " " - ۱۴

تدبر قرآن ★ تفسیر سورۃ الانعام(۲)...مولانا امین احسن اصلاحی - ۱۷

افادات فراہی رح ★ جبر و اختیار کا مسئلہ .... خالد مسعود - ۲

مقالات ★ اسلامی ریاست میں عورتوں کے

حقوق و فرائض ....مولانا امین احسن اصلاحی -

★ اسلام اور امن عالم .... اسرار احمد .

تاریخ تصوف اسلامی ★ حضرت حارث المحاسبی رح

اور ان کی کتاب الرعایۃ...پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★ باب وصف الکبر (۱)

ماخوذ از کتاب الرعایہ (ترجمہ) " " "

یکے از مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ

موہنی روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - ۱ فون 69522

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجّہات قرآن حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبّت جاگزیں ہو ـــــ اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشرواشاعت کیلئے وقف کریں،

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

قواعد و ضوابط

★ میثاق ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔
★ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے سے بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہو جانی چاہیئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جاسکے گا۔

★ ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے
★ پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہوگا۔
★ کمیشن ۲۵ فی صد ——— ★ محصول ڈاک بذمہ میثاق

★ قیمت فی پرچہ ——— ایک روپیہ
★ سالانہ زرمبادلہ ——— دس روپے
★ مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک ۔ پچیس روپے

نرخنامہ اشتہارات

★ ٹائیٹل کا آخری صفحہ "۵ × ۷" ۱۲۵ روپے
★ ٹائیٹل کے اندرونی صفحات ۵ × ۸½ ۱۰۰ روپے
(ان کے لیے بلاک مہیا کیجئے ورنہ ٹائپ کی طباعت ہوگی)
★ اندرونی صفحات ۔ فی صفحہ ۷۵ روپے ۔ نصف صفحہ ۵۰ روپے
★ بیک وقت چار یا اس سے زائد اشاعتوں میں اشتہار کے آرڈر پر ۲۵ فیصد رعایت

★

ہندوستان کے خریدار

مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقوم ارسال کرکے ہمیں مطلع فرمادیں

۱۔ دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنو
۲۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ

اسرار احمدؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

گذشتہ ماہ کا تذکرہ و تبصرہ، ہم نے اس نسبتاً پرسکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی ٹیچل کے بعد کچھ دنوں کے لئے آیا تھا۔ اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ "عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو"! تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آ جائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی!

بہرحال، متوقع یا غیر متوقع، طوفان کا یہ دوسرا ریلا تھا بہت سخت، جس میں معاطہ جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھی چارج اور آنسو آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ، لوٹ مار، آتش زنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر مہلک ہتھیاروں کے استعمال تک ——— اور حکومت کی جانب سے پولیس کی فائرنگ، فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک پہنچا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی ——— اور اگرچہ ان سطور کی تحریر کے وقت صورت حال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی۔ چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے، تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیئے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

ہم نے گذشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا ——— اور اب پھر اعادۃً عرض ہے کہ ہمیں ملک کی سیاست سے براہ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند!"

کے مصداق ہمارا مزاج ہی سیاست سے موافقت نہ رکھتا ہو اور ہم اپنی افتادِ طبع کے باعث اس سے بُعد محسوس کرتے ہوں لیکن جہاں تک ہماری شعوری سوچ کا تعلق ہے، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اصل دلچسپی دین و مذہب سے ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ اگرچہ ہماری ملکی سیاست کے میدان میں مسلسل دین و مذہب کا نام لیا جاتا رہا ہے اور اس وقت بھی دو مضبوط مذہبی گروہ پاکستانی سیاسیات میں بر سرِ کار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری موجودہ ملکی سیاست کا کوئی تعلق اسلام سے ہے، اور نہ ہی گذشتہ اکیس سال کے دوران کبھی دین و مذہب کو پاکستان کی سیاست میں کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

بایں ھمہ ——— چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش سے بالکل لاتعلق نہیں رہ سکتا اور ملک و ملت کے مسائل تو بہت اہم ہیں، گلی اور محلّے کے معاملات سے بھی کسی انسان کے لئے قطعاً لاتعلق رہنا ممکن نہیں، لہٰذا گذشتہ ماہ بھی ہم نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا تھا اور اپنے فہم کی حد تک موجودہ سیاست کے حدود دار بعہ کے تعیّن کی کوشش کی تھی ——— اور اس ماہ بھی ہم اپنی رائے جو خالصتہً ملک و ملت کی خیر خواہی اور قوم و وطن کی نصح و ہمدردی پر مبنی ہے، پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملّی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورتِ حال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا اور اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہارِ برأت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر، اور زیادہ تر خود حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لئے از خود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے؛ تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مصر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔ وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے اور گویا ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے۔ اور ہمیں ابھی ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔

ہمارے یہاں، جیساکہ ہم نے گذشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا، اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت مند روایات قائم ہوتی چلی جائیں۔ اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی۔ بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہوگئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دقت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام و نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محب وطن اور محب قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں، مبادا ملک وملت کے دشمن آزادی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں، اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بے گانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوتے ہیں اس کا مظہر اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہیئے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو مہیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہوگیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہیئے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص

مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے ——— چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع " دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گذشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پہ جو پابندیاں عائد کئے رکھی ہیں ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا سا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک دن پھٹنا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہماہمی ان ہی کی رہین منت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں بہت سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کئے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آرہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ——— حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورتِ حال بھی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پہ اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطہ ہائے نظر سے نہیں بلکہ قومی و ملّی نقطۂ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے پیشِ نظر سیاسی انقلاب کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں۔ وہ درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانۂ تعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملکی و قومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے۔ لیکن دورانِ تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلہ کار بننا طلبہ کے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبارات سے بھی سخت مضر ہے۔

اس تازہ ایجی ٹیشن پہ صدر ایوب کا ردِّ عمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتِ حال کو صرف "بعض شر پسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدّد کی راہ اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پہ گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانشمندی کا ثبوت دیا

ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہیئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے، معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں ——— لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جد و جہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی ——— پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے، مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع "آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہیئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے، جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا ——— اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہیئے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدان سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کنونشن لیگ سے ——— متحدہ ہندوستان جب انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومت وقت اور تحریک آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈ لاک ہو جاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص محب وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ تاریخ تحریک آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک نہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحاب فہم و بصیرت جانتے ہیں کہ

حصول آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے ——— ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورت حال بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کے ناخن تدبیر سے سلجھ سکتی ہے ——— اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورت حال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

یہ تو ہے موجودہ پیچیدہ صورت حال کا فوری حل ——— باقی جہاں تک پاکستان کی موجودہ سیاست کے مستقبل خطوط کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں جو تجزیہ ہم نے گذشتہ ماہ ان صفحات میں پیش کیا تھا، ہمیں خوشی ہے کہ قارئین میثاق نے بھی بالعموم اس سے اتفاق کا اظہار کیا اور بعد کے بعض حالات و واقعات سے بھی ان کی مجموعی حیثیت سے تائید و توثیق ہوتی۔

یہ بات اب مزید واضح ہو گئی ہے کہ آئندہ اس ملک کی سیاست کا اصل محور دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کا تصادم ہوگا۔ موجودہ حکومت بھی واضح طور پر دائیں بازو کی جانب جھک چکی ہے اور پی ڈی ایم کے اکثر عناصر بھی واضح طور پر اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ گویا پی ڈی ایم اس وقت حقیقی و واقعی اپوزیشن نہیں، مصنوعی اپوزیشن ہے جس کا موجودہ حکومت سے اصل اختلاف نظریات پر نہیں ذاتیات پر مبنی ہے جس پر بعض فروعی دستوری اختلافات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے ——— لہٰذا بساطِ سیاست کے موجودہ نقشے میں بہت جلد تبدیلیاں واقع ہوں گی اور پھر اس ملک کی سیاست کی اصل بساط بچھے گی جو دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم پر مبنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی اے سی کے نام سے جو وسیع تر اتحاد وجود میں آیا تھا وہ مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ سابق سندھ کے بعض مقامات پر جب ڈی اے سی کے تحت جلوس نکالنے کی کوشش کی گئی تو بعض نعروں اور کتبوں کی عبارتوں پر شدید اختلاف ہو گیا چنانچہ ڈی سی اے کی صرف چار جماعتیں اس میں شریک ہو سکیں اور بقیہ چار نے علیحدگی اختیار کی۔

دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل ——— اور مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوشلزم و کمیونزم کے حامی عناصر کی اس باہمی ٹکر میں ہمیں اندیشہ ہے کہ اسلام کا نام خواہ مخواہ لیا جائے گا جس سے کسی فریق کو تو شاید نہ کوئی نفع پہنچے نہ نقصان لیکن اسلام کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشاۃ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گذشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی،

مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقۂ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریک مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتہً بڑی عزت ہے۔ لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں!

اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزا جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں، اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظام عدل و قسط کے بھی بعض اجزاء سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے ——— بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے ——— ! اسلامی نظام معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور اس میں یہاں جمہوریت کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو بر سرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفر بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے

دریں حالات ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا تکلف ہے۔ ہمارے یہاں نہ حامیان جمہوریت، جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضہ یہی معلوم ہوا ——— یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے خالصتہً غیر مذہبی و لا دینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (REFERENCE) ہی نہیں! حامیان دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو بپتسمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے ——— !

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تا حال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تا حال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے۔ وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام برآمد ہوا تھا۔ اس نے اوّلاً سیاسی شعبہ زندگی میں جمہوریت (DEMOCRACY) کی صورت اختیار کی جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (CAPITALISM) کی کریہہ صورت اختیار کر لی۔ جس کا ردّ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردّ عمل ہے —— اس ردّ عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملہ بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی مدّعی جمہوریت ہی کے ہیں —— چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریہ چین" ہی کہلاتا ہے —— !!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اوّلاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا۔ لیکن اب دنیا کے تمام زیر ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتہً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیان دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دارالافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان سے بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیچے دروں و نیچے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے —— اور ہوتا رہے گا جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتہً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں —— جس کے امکانات بحالات موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے !!

ہمارے اس وقت کے مجملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :

۱۔ آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتہً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے، ہم

بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں، بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (FEUDAL LORDS) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت یافتہ سروسز (SERVICES) نے انہیں اُچک لیا۔ خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ چونکہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نااہل ثابت ہو جانے پر کلیتہً سروسز کو منتقل ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردّ عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

۲۔ آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا۔ اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی۔ تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے تحت ہوا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے ——— اس کے ردّ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ تقسیم دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردّ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزا ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں!! ———!!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے۔ لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریک پاکستان کے دوران بھی جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللہ" بتایا گیا۔ جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گذر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں، بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم ——— اور اب بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ———!!

جمعیت علمائے اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجئے۔ اس لئے کہ وہ پاکستانی سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ این اے پی اور

پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں ——!!

البتہ جماعتِ اسلامی اس لئے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرعمل ہوتے پورے اکیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامت دین ہے !!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے —— !! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو۔ دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی —!

پاکستانی سیاست کے افق پر اوّل اوّل جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا "لا الٰہ الا اللہ" کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر، اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلاب قیادت کی مہم تنہا اپنے بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیشکش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زور بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست "علماء کے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تا حال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے —— !! —— اور جس کا مظہر کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں۔ اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں مغرب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گذارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی و لادینی رُخ پر بہہ رہا ہے، اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ، گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظام معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں، اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رُخ کا جو دھارا ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے اُس کا رُخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا ازسرِ نو احیاء ہو۔ ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے، اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتدبہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہوگا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو۔ اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے ——— ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی رُوح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو۔ اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامت دین ہو، موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ ——— اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیا کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ——— اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی ازسرِ نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور ——— اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور ابتری کی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہوگی۔ اور ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی

کوئی راہ موجود نہیں ——— اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی چاہیے اس کے کوئی محسوس نتائج سامنے نہ آئیں۔ ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جاتے۔ لیکن بجائے اس کے رُخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے! ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف

آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پہ مرنے کی سعادت نصیب فرمائے!! ——— آمین!

مولانا امین احسن اصلاحی کے درس قرآن و حدیث کا سلسلہ رمضان المبارک میں بند ہو گیا تھا۔ بعد میں مولانا کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے تعطل جاری رہا۔ اب بھی اگرچہ مولانا کی صحت اطمینان بخش نہیں ہے اور گاہے گاہے دوران سر کی تکلیف عود کر آتی ہے۔ تاہم پہلے کی نسبت خاصہ افاقہ ہے لہذا درس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔

احباب مطلع رہیں کہ اب مولانا کا درس ہر جمعے کو عصر اور مغرب کے مابین جامع مسجد ہرن روڈ کرشن نگر میں ہو گا ——— اور سورۃ الانعام ہی مسلسل زیر درس رہے گی۔

حلقہ مطالعہ قرآن سمن آباد کے اجتماعات بحمد اللہ رمضان المبارک میں بھی جاری تھے۔ اور بحمد للہ حسب دستور اتوار کی صبح کو ۲۱۱ - اے (این) سمن آباد میں باقاعدگی سے جاری ہیں۔ جہاں لاؤڈ سپیکر کا بندوبست بھی ہے اور خواتین کے لئے پردے کا اہتمام بھی ہے۔

کرشن نگر میں مطالعہ قرآن کی ہفتے میں تین نشستیں ہو رہی ہیں۔ سوموار اور منگلوار کی رات کو بعد نماز عشا جامع مسجد ہرن روڈ میں۔ جہاں آخری پارہ تسلسل کے ساتھ زیر مطالعہ ہے ——— اور بدھوار کی رات کو اسی وقت مکان ملک۔ عمر روڈ (سابقہ بڈ بشٹر روڈ) میں، جہاں انشاء اللہ بدھوار ۱۲ فروری سے قرآن مجید کا مطالعہ بالکل ابتدا سے تسلسل کے ساتھ شروع ہو گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کتاب عزیز کا علم و فہم اور اس کی علم و حکمت کی نشر و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے ——— آمین

افاداتِ ابنِ قیمؒ
ترجمہ و ترتیب: اسرار احمدؐ

توکّل کے مراتب و اقسام

مراتب توکّل علی اللہ کے دو مراتب ہیں: ایک دنیوی حوائج و ضروریات کی تکمیل اور دنیوی مصائب و تکالیف سے تحفظ میں اللہ پر توکّل —— اور دوسرے ایمان اور یقین جیسی نعمتوں کی تحصیل اور جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ جیسے کاموں کی توفیق میں اللہ پر توکّل جو اللہ کو محبوب ہیں اور جن سے وہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے —— اور ان دونوں کے مابین رُتبہ و فضل کا ایسا عظیم الشان فرق ہے کہ اس کا احاطہ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

تو جب بندہ دوسری قسم کے اعتبار سے توکّل کا حق ادا کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نوع اوّل کی ضروریات کو خود ہی پورا فرما دیتا ہے —— لیکن اگر وہ صرف قسم اوّل ہی کا توکّل اختیار کرتا ہے تو اس معاملے میں تو اللہ تعالیٰ اس کی تمام ضرورتوں کو پورا فرما دیتا ہے۔ لیکن اسے اس شخص کا سا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جس نے مرضیاتِ رب کی تحصیل میں اپنے رب پر توکّل کیا ہو!

پس —— توکّل کا سب سے اونچا درجہ یہ ہے کہ —— بندہ ہدایت اور توحیدِ خالص کے حصول اور اتّباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور اہل باطل سے جہاد کی توفیق میں اللہ پر توکّل کرے —— !

اور دراصل انبیاء و رسل اور ان کے خواصِ صحابہ و تابعین کا توکّل اسی نوع کا ہے!!

اقسام ۱۔ توکّل کبھی اضطراری بھی ہوتا ہے یعنی اس حال میں کہ جب انسان لاچار ہو جاتے اور

اسباب و وسائل سرے سے موجود نہ ہوں اور انسان کی جان پر بن آئے اور وہ یہ محسوس کرے کہ اب اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی موجود نہیں۔ یہ توکل انسان کے لئے کچھ سود مند نہیں!

(ب) دوسرا توکل اختیاری ہوتا ہے۔ یعنی اس حال میں کہ مقصد تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع موجود ہوں پھر بھی اصل توکل اللہ ہی پر ہو۔ اس دوسری قسم کی بھی متعدد صورتیں ہیں:

۱۔ اگر اسباب و وسائل ایسے ہوں جن کے استعمال کا دین میں حکم ہو تو ——— ان کو ترک کرکے محض توکل کرنا بھی غلط ہے۔ اور توکل علی اللہ چھوڑ کر ان پر تکیہ کرتے ہوئے ان کا استعمال بھی غلط ہے اس لئے کہ نص قرآن اور اجماع امت دونوں کی رُو سے اس صورت میں وسائل و اسباب کا استعمال اور توکل علی اللہ دونوں لازمی ہیں۔

۲۔ اگر اسباب و ذرائع ایسے ہوں کہ ان کا استعمال حرام ہو تو اس صورت میں واجب ہے کہ ان کو ترک کیا جائے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے ——— اس صورت میں درحقیقت توکل علی اللہ ہی سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے اچھا وسیلہ ہے!

۳۔ اور اگر اسباب و ذرائع مباح کی نوعیت کے ہوں ——— تو دیکھنا چاہیئے کہ ان کے استعمال سے توکل علی اللہ میں ضعف تو پیدا نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہو اور وسائل و ذرائع کے استعمال سے قلب میں انتشار پیدا ہوتا ہو تو ان کا ترک لازم ہے بصورت دیگر ان کا استعمال ضروری ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہی نے اسباب و وسائل کے اس سلسلے کو قائم فرمایا ہے تو جہاں اور جب بھی اس کے اس نظام سے استفادہ کیا جا سکتا ہو، وہاں ایسا کرنا لازم ہے۔ اور جب ایک بندہ ایسی صورت میں اسباب و وسائل کو استعمال کرتا ہے تو گویا اس کی جانب سے عبدیت کا دوہرا اظہار ہوتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ اپنے دل کی جانب سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہدیۂ توکل پیش کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے بقیہ اعضا کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے قوانین کے اتباع و اطاعت کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔

حقیقتِ توکل رہا توکل کا اصل راز اور اس کی اصل حقیقت تو وہ یہ ہے کہ دل کا اصل اعتماد خالصتہً اللہ تعالیٰ پر قائم ہو جائے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے اور وسائل و ذرائع پر قلب کا اعتماد بالکل نہ ہو تو ان کے استعمال میں قطعاً کوئی ضرر نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر قلب کا سارا اعتماد وسائل و ذرائع پر ہو، تو زبان سے "توکلت علی اللہ" کہنے سے کچھ فائدہ نہیں!! پس زبان کا توکل اور ہے اور قلب کا اور!!

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور! اقبالؒ
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

- دعوت دین اور اس کا طریق کار
  صفحات ۳۱۲، قیمت ۳/۷۵ روپے
- اسلامی قانون کی تدوین
  صفحات ۱۶۰، قیمت -/۳ روپے
  سستا ایڈیشن " -/۲ روپے
- تزکیۂ نفس
  صفحات ۳۴۴، قیمت: -/۶ روپے
- عائلی کمشن رپورٹ پر تبصرہ
  صفحات: ۱۲۸
  قیمت: ۲/۲۵ روپے

حقیقت خلافت و ملوکیت

تالیف: علامہ سید محمود احمد عباسی

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیف
'خلافت و ملوکیت' کا مسکت جواب

مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

سائز ۲۳×۳۶/۱۶ صفحات: ۵۶۸، مجلد

قیمت: قسم اوّل سفید کاغذ مع ڈسٹ کور: ۱۱/۶۰۰ روپے
" قسم دوم نیوز پرنٹ: ۶/۷۵۰ روپے

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات: ۳۸۴، مجلد مع ڈسٹ کور

قیمت چار روپے صرف:

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۲)

آگے کا مضمون، آیات ۳۳-۵۰

اوپر کا مجموعۂ آیات، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تسلی کے مضمون پر ختم ہوا ہے۔ اب وہی تسلی کا مضمون آگے بڑھ رہا ہے البتہ اس تسلی میں کچھ تیزی بھی آگئی ہے اگرچہ یہ تیزی جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا تعلق ہے اپنے اندر نہایت دلنواز ٹھنڈک رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں عتاب و غضب کا جو پہلو ہے، اس کا رخ تمام تر ان ہٹ دھرم منکرین کی طرف ہے جو درپے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ پیغمبر ہیں اور جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں خدا کا کلام و پیغام ہے۔ قدرتی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اور عام مسلمانوں پر بھی ان کے اس مطالبے کا اثر پڑتا تھا۔ خاص طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا رافت و رحمت تھے اور اپنی قوم کے ایمان کے لیے اپنے اندر نہایت گہری تڑپ رکھتے تھے اس مطالبے سے متاثر ہو کر اس بات کے خواہش مند ہو جاتے تھے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے، شاید یہ اس طرح ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی کہ ان کا یہ مطالبہ تمہارے لئے وجہ پریشانی نہ ہونے۔ یہ تمہاری تکذیب نہیں بلکہ آیات الٰہی کی تکذیب ہو رہی ہے تو جب خدا سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور ان کا مطالبہ پورا کرنے کی قدرت کے باوجود پورا نہیں کر رہا ہے تو تم کیوں پریشان ہو۔ تم سے پہلے جو انبیاء آئے ان کی بھی اسی طرح تکذیب ہوئی، انہوں نے

برداشت کیا اسی طرح تم بھی برداشت کرو۔ سنت الٰہی یہی ہے۔

اس کے بعد نہایت تیکھے اور تند انداز میں فرمایا کہ اگر اللہ بجبر و زور ان کو ایمان کی راہ پہ لانا چاہتا تو سب کو آن کے آن میں مومن و مسلم بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہی پسند فرمایا کہ لوگ اپنی عقل و فہم سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں تو تم ان کے ایمان کی خواہش سے مغلوب ہو کر کیوں اس بات کے لئے بے قرار ہوتے ہو کہ لازماً کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہی ہو جائے جو ان کو قائل کرکے خدا کے آگے جھکا ہی دے۔ خدا تو یہ بات نہیں چاہتا۔ تم اگر چاہتے ہو تو آسمان و زمین جہاں سے ہو سکے اس طرح کا معجزہ لاکر دکھا دو۔

اس کے بعد بتایا کہ کن صفات کے لوگ ایمان لائیں گے، کن صفات کے لوگ معجزے ہی مانگتے رہیں گے۔ پھر ان کے مطالبہ کے مطابق معجزہ نہ بھیجنے کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کائنات میں قدرت کے جو بے شمار معجزات ہیں اور اللہ نے اپنی کتاب میں جو دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ جو لوگ ان چیزوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں وہ گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کوئی نشانیٔ عذاب مانگتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ اگر کوئی عذاب آ گیا یا قیامت ہی آگئی تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انہوں نے کر رکھا ہے؟ اس وقت تو خدا خدا ہی پکاریں گے۔ اس سلسلے میں انبیا اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان قوموں کو ہم نے اپنی اس طرح کی نشانیاں دکھائیں لیکن انہوں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ کر دی گئیں۔ اسی طرح اگر یہ کسی ظاہری یا باطنی پکڑ میں آ گئے تو اس سے ان کو خدا کے سوا کون بچانے والا بنے گا۔

آخر میں انبیاء کا فریضۂ منصبی بتا دیا کہ ان کا کام انذار و تبشیر ہے نہ کہ معجزے اور عذاب کی نشانیاں دکھانا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ نہ میں خدا کے خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب جانتا ہوں نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں۔ بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر آتی ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو مانے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بہر حال ثابت ہے کہ خدا کے ہاں اندھے اور دیکھنے والے دونوں ایک درجہ میں نہیں ہوں گے۔ اس روشنی میں آگے کی آیت کی تلاوت فرمائیے۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ

وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۳۳ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا
مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۳۴
وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِىَ
نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۳۵ اِنَّمَا
يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ۳۶ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ
اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۳۷
وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰۗىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ
اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ
يُحْشَرُوْنَ ۳۸ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ۭ
مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۳۹
قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۴۰ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ
اِلَيْهِ اِنْ شَاۗءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۴۱ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ
مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۴۲
فَلَوْلَآ اِذْ جَاۗءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ
زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۴۳ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا
بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ
اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۴۴ فَقُطِعَ
دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۴۵
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ
عَلٰي قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ
كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۴۶ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ

إِنْ أَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝
وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ
الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ قُلْ لَّا أَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا
أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُوْلُ لَكُمْ إِنِّيْ مَلَكٌ ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوْحٰى إِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ
يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ہم آگاہ رہتے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے تو صبر کرو، یہ تو تمہیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انہوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیئے جانے پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۳-۳۴

اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو کر دیکھو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا، پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۵-۳۶

اور یہ کہتے ہیں، اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ سب تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

کہہ دو، بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا قیامت آ دھمکے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دور

کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاتے ہو۔ ۴۰-۴۱

اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ہماری پکڑ آئی وہ خدا کی طرف نہ جھکے بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں اسی عمل کو کھبا دیا جو وہ کرتے رہے تھے تو جب انہوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے جو انہیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا، وہ بالکل ہک دک رہ گئے پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ اور شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے تمام عالم کا رب!۔ ۴۲

کہو، بتاؤ، اگر اللہ تمہارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لا دے، دیکھو کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ پوچھو، بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر بے خبری میں اچانک آ دھمکے یا ڈنکے کی چوٹ آئے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا؟ اور ہم رسولوں کو تو صرف خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں تو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم ہوگا۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان کی نافرمانی کی پاداش میں ان کو عذاب پکڑے گا۔ ۴۳-۴۹

کہہ دو، میں تمہارے سامنے یہ دعوے نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعوے کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ کہہ دو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔! ۵۰

۵۔ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی توضیح

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ

وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ
مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ
وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۳۳-۳۴

زبان کا ایک اسلوب اور کفار کے مطالبات سے بے اعتنائی کی حکمت

'قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون'۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مضارع پر اس طرح 'قد' آتا ہے تو وہ پتہ دیتا ہے کہ یہاں فعل ناقص کا صیغہ محذوف ہے۔ گویا 'قد نعلم' اصل میں 'قد کنا نعلم' ہے جس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ یہ بات برابر خدا کے علم میں رہی ہے اور ہے، وہ اس سے کبھی بےخبر نہیں ہوا کہ جو کچھ یہ ہٹ دھرم منکرین و مکذبین کہتے ہیں اس سے تمہیں غم پہنچتا ہے۔ "جو کچھ کہتے ہیں" سے مراد اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی طرف آیت ۸ میں اشارہ گزر چکا ہے یا آگے آیات ۳۷ و ۵۰ میں آرہا ہے کہ اگر یہ خدا کے فرستادہ ہیں تو یہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، ان پر ان کی صداقت کی منادی کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا، یہ آسمان سے براہ راست کوئی کتاب مابین الدفتین اترتی کیوں نہیں دکھاتے، یہ کسی خزانے کے مالک کیوں نہ ہوئے، جس عذاب کے ڈراوے سنا رہے ہیں اس کا کوئی نمونہ کیوں نہیں دکھاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا کہ یہ سب باتیں ہم جانتے، دیکھتے سنتے رہے ہیں تو پھر علم اور قدرت کے باوجود اگر ہم نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو اطمینان رکھو ہم نے اسی میں حکمت اور بہتری سمجھی۔

تسلی کا ایک دلنواز پیرایہ

'فانہم لا یکذبونک ولکن الظالمین بآیات اللہ یجحدون'۔ یہ تسکین و تسلی کا نہایت دلنواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے علم اور قدرت کے باوجود ان کی ان خرافات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو تم بھی صبر کرو، یہ تمہاری تکذیب تو نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام حاکبازی اور ان تمام استہزاء کا ہدف تم تو نہیں ہو، اصل ہدف تو ہم اور ہماری کتاب ہے، پھر تم اپنے دل کو آزردہ کیوں کرو، معاملے کو ہم پر چھوڑو۔ ساتھ ہی ان کے لیے 'ظالمین' کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس سے نقصان کسے پہنچ رہا ہے؟ خود انہی کو۔ یہ بدقسمت اور نامراد لوگ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ نہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں، نہ خدا کا۔

نصرتِ الٰہی کے ظہور کے لیے سنتِ الٰہی

'ولقد کذبت رسل من قبلک'۔ یہ اسی تسکین و تسلی کے مضمون کی تائید و تقویت کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کی امتوں کے امتحان

کے لیے پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ انبیا اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہمکنار ہونے کے لیے ابتلا و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیاء کی قوموں کی طرف سے برابر ان کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے وہ بھی ابھر کر باہر آجاتا ہے اور جو جوہر نبی اور اس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے وہ بھی نکھر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرین حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور اس کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگزشتیں اس سنت اللہ پر شاہد ہیں اور تمہیں ان سرگزشتوں کا کچھ حصہ سنایا بھی جا چکا ہے جس سے تم پر اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کے حالات سے انہیں گزرنا پڑا ہے اسی طرح کے حالات سے تمہیں بھی گزرنا ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳۵-۳۶)

وَاِنْ كَانَ ..... فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۔ اس جملہ میں جواب شرط محذوف ہے اور فصیح عربی میں جواب شرط کا حذف ایک معروف بات ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

'جہل' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ علم اور حلم دونوں کے ضد کی حیثیت سے آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال 'حلم' کے ضد کی حیثیت ہی سے ہے۔ اسی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جذبات سے مغلوب ہو جانا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی طہارت فطرت کے سبب سے جذبات نفس اور خواہشات نفس سے تو کبھی مغلوب نہیں ہوتے لیکن جذبات خیر میں سے کسی جذبہ کا غلبہ ان پر بھی کبھی کبھی اتنا ہو جاتا ہے جو حد مطلوب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود نہایت اعلیٰ بات ہے لیکن حضرات انبیا چونکہ معیار اور کسوٹی ہوتے ہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پہلو میں بھی ان کو حد مطلوب سے آگے نہیں

نبی ہر پہلو سے کسوٹی ہوتا ہے۔

بڑھنے دیتا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ نبی کے اندر اس بات کی شدید آرزو ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے تاکہ وہ عذاب الٰہی سے بچ جائے۔ یہ جذبہ نبی کی رافت و رحمت کی دلیل اور اس کی غیرت حق کی شہادت ہے لیکن یہ جذبہ بھی مطلوب اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے ہم آہنگ ہے جو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی طرف آیت ۳۴ میں اشارہ گزرا۔ اگر اس حد سے اس کے آگے بڑھنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔

'انما یستجیب الذین یسمعون والموتیٰ ...' 'یسمعون' یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی جو سنتے اور سمجھتے ہیں۔ جو سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں ان کا سننا اور نہ سننا دونوں برابر ہے۔ 'موتیٰ' سے مراد یہاں عقل اور دل کے مُردے ہیں اس لئے کہ زندگی درحقیقت عقل اور دل ہی کی زندگی ہے۔ جو مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

ان آیات میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز عتاب ہے اور اگر اس میں کوئی تلخی اور ترشی ہے تو اس کا رُخ تمامتر ان ضدیوں اور ہٹ دھرموں کی طرف ہے جن کے ایمان کی آرزو پیغمبرؐ کے اندر اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنے پر راضی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی نہ کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا ایمان نہ لانا تم پر اتنا ہی شاق گزر رہا ہے تو تم زمین کے اندر کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کر کے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ لا سکو تو لاؤ، ہم تو معجزوں کے بل پر دلوں کے اندر ایمان اتارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم نے تو ایمان کے لیے جو راہ پسند کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے کان، آنکھ اور عقل و ادراک کو استعمال کریں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر جبر اور بزور لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دینا ہوتا تو ہمارے لئے یہ کیا مشکل کام تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان و ہدایت کی راہ پر چلا دیتے۔ تو تم ان کے ایمان کی آرزو میں اتنے جذبات سے مغلوب نہ ہو جاؤ کہ اس باب میں جو اللہ کی حکمت اور سنت ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہاری دعوت تو وہی قبول کریں گے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور جن کے دل زندہ ہیں، جو گونگے بہرے ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو بس اللہ کے حوالے کرو،

جب یہ قیامت کو اٹھیں گے تو ان پر سارے حقائق کھل جائیں گے۔ ان کے پیچھے تم اپنے کو ہلکان غم نہ کرو۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم ۚ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ ۗ مَن يَشَإِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ ۖ وَمَن يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۳۷-۳۹

وقالوا لولا نزل عليه آية من ربه ۔ اس سے مراد یوں تو ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ہو سکتی ہے جن کا کفار کی طرف سے مطالبہ تھا لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے جو کسی ایسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو یہ ثابت کر دے کہ اگر انہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آ جائے گا۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ قرینہ خود بخود ابھر کر سامنے آ جائے گا اس وجہ سے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سورہ میں بھی اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی کفار کا یہ مطالبہ اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں سے نقل ہوا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم نے تمہاری تکذیب کی تو ہم پر عذاب آ جائے گا تو اس عذاب کا کوئی نمونہ ہمیں دکھا دو جس کی دھمکی سنا رہے ہو، بس اسی سے ہمارے اور تمہارے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

قل ان اللہ قادر علی ان ینزل آیۃ ولکن اکثرھم لا یعلمون ۔ فرمایا کہ خدا تو اس طرح کا کوئی نشان دکھا دینے پر ہر وقت قادر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔ "اکثر لوگ جانتے نہیں" بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں، ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشہ ہے حالانکہ یہ نشانی اگر ظاہر ہو گئی تو سب کی کمر توڑ کے رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ لوگ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ

نے پسند فرمائی ہے اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکی ہے تب خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر ان کو کوئی چھڑا نہیں سکتا تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بندھے ہیں حالانکہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسّی کتنی ہی دراز کر دے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدقسمت لوگ اس رحمت سے ناآشنا ہیں جو اس مہلت کے اندر مضمر ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اس وقت تک کھلے رکھتا ہے جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود ان کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔

وما من دابة في الارض ولا طائر يطير بجناحيه الا امم امثالكم

اس ٹکڑے میں حذف کا وہی اصول ملحوظ ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۱۳۴ میں ہے یعنی جملے میں مقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ مثلاً جملے کے پہلے حصہ میں 'فی الارض' کا لفظ ہے تو دوسرے حصے میں 'فی السماء' کا لفظ حذف ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں 'یطیر بجناحیہ' کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں 'تدب علی رجلیہا' یا 'علی ارجلہا' کے الفاظ حذف ہو گئے۔ فصیح عربی میں اس طرح کا حذف معروف ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع میں محذوف کو کھول دینا زیادہ بہتر ہے ورنہ یا تو پوری بات ادا نہیں ہو پاتی یا جملہ کا دروبست ٹھیک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

'الا امم امثالکم' کے الفاظ تو بظاہر نہایت مجمل ہیں لیکن غور کیجئے تو ان میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ نشانیاں مانگنے والوں کو یہ آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم کوئی ایک نشانی مانگتے ہو، خدا کی تو یہ پوری کائنات نشانیوں سے بھری پڑی ہے، زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک زندہ نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جس طرح تمہارے انفرادی و اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت کی بیشمار نشانیاں ہیں جو تم پر توحید، جزا و سزا اور پیغمبر کی دعوت کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں اسی

طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات کے اندر بھی خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے دلائل موجود ہیں۔ جس طرح تم ایک نوع ہو، اسی طرح یہ بھی الگ الگ نوعیں ہیں، جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو، اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں، جس طرح تم شعور اور ادراک اور ارادہ و اختیار رکھتے ہو، اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہیں، جس طرح تمہارے اجتماعی شعور نے تمہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک سیاسی نظام کے اندر باندھ کے رکھو اسی طرح ان کی ہر نوع کے اندر بھی اپنی اجتماعی ہستی کا ایک شعور ہے جو انہیں آمادہ کرتا ہے کہ یہ ایک وحدت کے اجزاء کی طرح اپنے اجتماعی وجود کے بقاء و تحفظ کا سامان کریں اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کرے۔ سورہ نحل میں قرآن نے اسی حقیقت کے ثبوت میں، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، شہد کی مکھی کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے نوعی نظام میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آج سائنس نے حیوانات کی مختلف انواع کے جبلی خصائص و عجائب سے جو پردے اٹھائے ہیں یوں تو ان میں سے ہر انکشاف انسان کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن نہایت حقیر اور چھوٹی چیزوں میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی ہی کو لیجئے اور ان کا مشاہدہ کیجئے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، اجتماعی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لئے کیسی انتھک سرگرمی ہے، رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لئے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے!!

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آگیا ہے اور اپنے ہی بل پر چل رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے؟ اگر اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے تو کیا وہ سب کچھ بنا کر ایک گوشہ میں بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے یا براہ راست اس پوری کائنات کی حفاظت فرما رہا ہے؟ کیا یہ سب کچھ کسی اندھی بہری قوت قاہرہ کا ظہور ہے یا کسی قادر و قیوم، علیم و حکیم اور رحمان و رحیم ہستی کی قدرت و رحمت کا فیضان ہے؟ کیا یہ مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور بے شمار دیویوں دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی ایک جلوہ گاہ ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ بالکل بے مقصد، بے غایت اور بے انجام نظر آتا ہے یا اس کی ایک ایک چیز پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور قطعی

اور نقیض ہے؟ کیا اس کے ظاہر و باطن سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ انسان اس کے اندر شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے یا اس سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ جس قادر نے یہ دنیا بنائی ہے، جس حکیم نے اس کے ایک ایک ذرے میں اپنی حکمت کی شان دکھائی ہے، جس رحیم نے اپنی ربوبیت و رحمت کے یہ خوانِ نعمت بچھائے ہیں وہ ایک دن سب کو ضرور اکٹھا کرے گا اور ہر ایک کی نیکی بدی کو ضرور تولے گا اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہ ہو گئی ہو تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ان سب باتوں میں سے دوسری ہی بات صحیح ہے۔ اگر یہی بات صحیح ہے اور بدیہی طور پر یہی صحیح ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر اس کو ماننے کے لئے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے؟ اس حقیقت کی شہادت تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ اس کا گواہ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کے اندر کی شہادتوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے تو باہر کی ان نشانیوں ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے جو نیچے بھی موجود ہیں اور اوپر بھی۔

قرآن دلائل کا خزانہ ہے

'ما فرطنا فی الکتب من شیء ثم الی ربھم یحشرون' میں عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'الکتاب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی شاہد ہیں اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی اپنے دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک ایک دعوے کو ایسے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے اور اتنے مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے حجت قائم کی ہے کہ صرف عقل و دل کے اندھے اور بہرے ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'ثم الی ربھم یحشرون' کے الفاظ میں یہ لطیف تعریض ہے کہ جہاں تک نشانیوں اور دلائل کا تعلق ہے ان سے تو یہ صحیفۂ کائنات بھی مملو ہے اور یہ صحیفۂ قرآن بھی معمور ہے لیکن جو کسی بات کو سمجھنا ہی نہ چاہیں ان کا کیا علاج؟ یہ تو اب اپنے رب کے سامنے جب حاضر کئے جائیں گے تب ہی آنکھیں کھولیں گے اور مانیں گے۔

قرآن کو جھٹلانے والوں کی مثال

'والذین کذبوا بایتنا صم و بکم فی الظلمت' 'بایتنا' میں 'آیات' سے مراد قرآن مجید کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان کی مثال

ایسے گونگے اور بہرے لوگوں کی ہے جو گونگے بہرے ہونے کے ساتھ ساتھ تاریکی میں گھرے ہوئے بھی ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ کسی کو پکار سکتے، نہ کسی پکارنے والے کی بات کا جواب دے سکتے، نہ کسی کے اشارے کو دیکھ سکتے، نہ کسی نشانی سے رہنمائی حاصل کر سکتے۔ ایسے سپاٹ اور چپاٹ لوگوں کا کیا علاج!

ہدایت ان کو ملتی ہے جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں

'من یشاء اللہ یضللہ الایہ' میں جیسا کہ ہم مختلف مواقع میں واضح کر چکے ہیں، اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت کسی کو ہدایت کی توفیق ملتی ہے اور کوئی گمراہی کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اور اپنے کان نہیں کھولتے خدا ان کے اندر زبردستی اپنی ہدایت نہیں اتارتا۔ خدا کی توفیق صرف ان کو سہارا دیتی ہے جو راہِ حق پر چلنے کا خود ارادہ کرتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔

آجزا کی اس تشریح سے آیات کا مفہوم اور نظم خود بخود واضح ہو گیا ہے۔ سورہ نحل میں یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے زیرِ بحث آئے گا۔ اس وجہ سے ہم یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ۔ ۴۰-۴۱

'ادیتکم' اور 'ادءیتکم' کا محلِ استعمال اور مفہوم ایک ہی ہے چنانچہ آگے آیت ۴۶ میں بالکل اسی محل میں ارءیتکم آیا ہے۔

توحید کی ایک انفسی دلیل

یہ مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب بھی ہے اور انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو سے توحید کی ایک ناقابلِ تردید انفسی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کے مقابلہ یا اس سے بچاؤ کا کیا سامان کر رکھا ہے؟ کون سی ناقابلِ تسخیر دفاعی لائن تم نے بنا لی ہے کہ اس زعم کے ساتھ خدا کو چیلنج کر رہے ہو؟ فرض کرو، جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو خدا وہی بھیج دیتا ہے یا جس قیامت سے تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے وہی آدھمکتی ہے تو کون ہے جس کو اپنی مدد کے لیے پکارو گے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے جس کو پکارو گے اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اس کے کچھ دوسرے شریک بھی ہیں؟ فرمایا کہ تمہارا یہ دعوے بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا وقت آگیا تو تم خدا کے سوا سب کو بھول جاؤ گے اور صرف اسی کو پکارو گے اور وہی ہے جو اس مصیبت کو اگر چاہے گا تو دور کرے گا۔

اوپر والی آیات میں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، توحید کے آفاقی دلائل کی طرف اشارہ تھا، یہاں توحید کی اُس انفسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصلی فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے، دوسرے اصنام و الٰہہ جن کو وہ مانتا ہے، ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت کے باطن میں موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ محض خیالی ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آ جاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے ان تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے، صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو نہایت دل آویز تمثیلوں اور نہایت حقیقت افروز دلائل سے واضح کیا ہے اور آگے یہ ساری چیزیں زیر بحث آئیں گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ [1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۴۲-۴۵

'وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰٓى اُمَمٍ الایہ۔' 'تضرع' کے معنی تذلل کے ہیں یعنی خضوع و خشوع اور احساس عجز و فروتنی کے ساتھ کسی کی طرف جھکنا۔ یہاں یہ لفظ دل کی خشیت اور احساس عبدیت و انابت کے ساتھ خدا کی طرف جھکنے کے لیے آیا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'قساوت' استعمال ہوا ہے جو دل کی سختی، بے خوفی اور رعونت کی تعبیر کے لیے قرآن کا معروف لفظ ہے۔

کسی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملے میں اللہ کی سنت الٰہی

اب یہ ایک سنت اللہ بیان ہوئی ہے جس سے ایک طرف تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کسی قوم پر، جس میں اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا ہے، عذاب بھیجنے کے معاملے میں وہ کیا طریقہ

---

[1] تفصیل کے طالب ہماری کتاب 'حقیقت توحید' میں 'توحید کے انفسی دلائل' کا باب پڑھیں۔

اختیار فرماتا ہے، دوسرے اس تاریخی شہادت کو سامنے لاتا ہے کہ جس قوم نے بھی ایمان لانے کی شرط نشانیِ عذاب کو ٹھہرایا اس کو ایمان کی سعادت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بالآخر عذاب ہی کے ذریعہ سے اس کی جڑ کاٹ دی گئی۔ فرمایا کہ تم سے پہلے (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہم نے بہت سی قوموں کے پاس اپنے رسول بھیجے تو ان کو مختلف قسم کی مالی و جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور وہ سوچیں کہ اگر انہوں نے نبی کی بات نہ مانی تو بالآخر خدا کی فیصلہ کن پکڑ آ جائے گی اور وہ تباہ کر دیئے جائیں گے لیکن دیکھ لو، تاریخ شاہد ہے، کہ بجائے اس کے کہ ان خدائی تنبیہات سے ان کے دل کچھ نرم پڑتے وہ اور زیادہ سخت ہو گئے اور جن بد اعمالیوں میں وہ مبتلا تھے شیطان نے ان کو ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیا کہ وہ ان سے باز آنے کے بجائے ان میں کچھ اور دلیر ہو گئے۔

'فلما نسوا ما ذکروا بہ الایۃ' و 'ما ذکروا بہ' کے معنی ہوں گے جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی۔ یہاں اس سے اشارہ اسی باساء و ضراء یعنی مالی و جسمانی مصائب کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لئے مبتلا کیا کہ وہ چیتیں کہ اگر انہوں نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو ان تنبیہات کے بعد اب آگے فیصلہ کن عذاب ہی کا مرحلہ ہے لیکن ان سے یہ سبق لینے کے بجائے انہوں نے ان کے گزر جانے کے بعد ان کو نظر انداز کر دیا کہ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حوادث تو پیش آیا ہی کرتے ہیں، قحط، سیلاب، طوفان، وبا اور امراض سے کس قوم کو سابقہ نہیں پیش آیا ہے 'قد مس اٰباءنا الضراء والسراء' اس طرح کے نرم و گرم حالات تو ہمارے اگلوں کو بھی پیش آ چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ یہ کسی شخص کی تکذیب کا نتیجہ ہے!

'فتحنا علیھم ابواب کل شیء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذناھم بغتۃ' ۔ اب یہ مذکورہ بالا سنۃ اللہ کا آگے کا مرحلہ بیان ہو رہا ہے جس کو قرآن کے دوسرے مقامات میں 'امہال' یعنی ڈھیل دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے، ان کی تمام مطلوبات کے دروازے ان پر کھول دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہو کے اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانہ کے لبریز ہو جانے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا دفعۃً ان کو پکڑتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ 'اُبلس' کے

لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

'دابر' کے معنی اصل اور جڑ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب مکذبین رسول اپنی بدمستی کی اس حد کو پہنچ جاتے ہیں تب ایسے ظالموں کی خدا جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں ان سے ان کے شجرِ ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، ان کی جڑ محفوظ رہتی ہے۔ لیکن جب یہ وقت آجاتا ہے تو خدا ان پر عذاب بھیجتا ہے جو ان کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے اس لیے کہ جو درخت زہریلا ہو چکا اور اب صرف زہریلے ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان و رحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے 'بالحق' پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا رب ہے۔ رب کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایک ایسے درخت کو جگہ گھیرے رکھنے کے لئے چھوڑ دے جس کی زہریلی ہوا اور جس کے مسموم برگ و بار پورے چمن کو غارت کر کے رکھ دیں۔ پس حمد و شکر کا سزاوار ہے وہ رب العالمین جو ایسی نابکار قوموں کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔

آیات کی تشریح کے ذیل میں آیات کا نظم اور مدعا واضح ہو گیا ہے البتہ جس سنت اللہ کا یہاں حوالہ ہے اس کی تاریخی شہادتوں کی طرف یہاں صرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل نہیں آئی ہے۔ یہ تفصیل آگے والی سورہ — اعراف — میں آئے گی جو اس سورہ کے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں عرب کی پچھلی معذب قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں سے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کیا، چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں کو نرم کرنے اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان کو مختلف مالی و جسمانی آزمائشوں میں مبتلا کیا لیکن انہوں نے ان سے سبق لینے کے بجائے ان کو اتفاقی حوادث پر محمول کر کے بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی اس سرکشی کے بعد خدا نے ان کو پوری ڈھیل دے دی۔ ہر راہ میں ان کو کامیابی ہی کامیابی نظر آنے لگی۔ شیطان نے ان کو پٹی پڑھائی کہ جس راہ پر چل رہے ہو یہی کامیابی کی راہ ہے، شاباش، آگے بڑھے چلو۔ بالآخر جب ان کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا اور کامیابیوں کے نشہ نے ان کو بدمست کر دیا تو دفعۃً خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا اور ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ——— مطلب یہ ہے کہ یہی مرحلہ تمہارے

جھٹلانے والوں اور تم سے عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو بھی درپیش ہے۔ اگر انہوں نے حالات سے سبق نہ لیا تو وہی تاریخ یہ بھی دہرائیں گے۔ تم مطمئن رہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ
عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ط اُنْظُرْ كَيْفَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ٥ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ
بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ ۴۶-۴۷

'قل ارءیتم ان اخذ اللہ الایۃ' 'صدف یصدف صدفا' کے معنی کسی چیز سے اعراض و انحراف اختیار کرنے اور اس سے رک رہنے کے ہیں۔

مطالبۂ عذاب کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ اسی مطالبۂ عذاب کا جواب ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ اگر خدا تم پر کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج دے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اب ارشاد ہوا کہ اگر خدا تمہیں کسی عقلی، باطنی اور روحانی عذاب میں گرفتار کر لے تو بھی تمہیں کوئی بچانے والا نہیں۔ ابھی تو تمہارے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں زندہ ہیں لیکن تم ان سے کام نہیں لے رہے ہو۔ اگر خدا تمہارے سمع و بصر کو سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر ٹھپہ لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے جو تمہاری ان صلاحیتوں اور قوتوں کو پھر بحال کر سکے! ۔ پھر فرمایا، یہ تو ایک نشانی مانگ رہے ہیں۔ دیکھو، ہم اپنی آیتیں کتنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں لیکن یہ سننے اور سمجھنے کے بجائے برابر اعراض ہی کیے جا رہے ہیں۔

'قل ارءیتکم ان اتاکم عذاب اللہ بغتۃ او جھرۃ الایۃ' 'بغتۃ' کے معنی کسی چیز کے اچانک، دفعۃً، بغیر کسی نوٹس کے، بالکل بے خبری میں آ جانے کے ہیں۔ 'جھرۃ' کے معنی ہیں، کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ، دن دہاڑے۔ مطلب یہ ہے کہ نشانی عذاب کا مطالبہ تو یہ کر رہے ہیں، ان سے پوچھو کہ خدا کا عذاب چپکے سے یا کھلم کھلا دن دہاڑے آئے اول تو اس کو روکے گا کون، پھر ان سے یہ پوچھو کہ یہ بجلی گری تو کن پر گرے گی، انہی ظالموں پر تو گرے گی جو اپنی شامت سے اس کو دعوت دے رہے ہیں اور جو اپنی بداعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر!

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو انبیاء کی تکذیب کرنے والی امتوں پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے۔ اس عذاب کے معاملے میں سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کے جھٹلانے

والے ہلاک کر دیئے جاتے ہیں اور اہل ایمان بچائے جاتے ہیں۔ رہی وہ آزمائشیں اور تکلیفیں جو تنبیہ و تذکیر کے لیے آتی ہیں، جن کا ذکر اوپر 'باساء' اور 'ضراء' کے الفاظ سے گزرا ہے تو وہ اس امتیاز کے ساتھ نہیں آتیں بلکہ ان میں سب حصّہ پاتے ہیں۔ البتہ اہل ایمان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہل کفر بدستور اپنی شرارت پر جمے ہی رہ جاتے ہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر گزرا، اس سے کچھ اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ
وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ ۴۸-۴۹

اب یہ اسی مطالبہ کے تعلق سے رسولوں کی بعثت کا اصل مقصد واضح فرما دیا کہ وہ عذاب کی نشانیاں دکھانے یا عذاب لانے یا خوارق و عجائب کی نمائش کرنے کے لئے نہیں بھیجے جاتے بلکہ وہ خدا کی رحمت کی خوش خبری دینے والے اور بصورت تکذیب و نا فرمانی اس کے عذاب سے خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ خوش خبری کی وضاحت یوں فرما دی کہ فمن اٰمن و اصلح فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون (جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے رویہ کی اصلاح کر لی نہ ان کے لیے مستقبل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ماضی کا کوئی غم) اور انذار کی تفصیل یوں فرمائی کہ والذین کذبوا بایٰتنا یمسھم العذاب بما کانوا یفسقون (اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے ان کو ان کی نافرمانی کی پاداش میں خدا کا عذاب پکڑے گا)۔ اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب ان کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ ان کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہئی وہ چیز چاہیئے جس کے لیے وہ آتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ تیسری یہ کہ یہ خوارق و عجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ ان کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے بلکہ ان کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے اگر اللہ تعالےٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اس میں رسول کے لئے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت ـــ بشارت اور انذار ـــ سے رکھے۔ جو باتیں اس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں ان کو خدا پر چھوڑ دے، بلا وجہ ان کے لیے پریشان نہ ہو۔

قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا

اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ ۵۰

اب یہ پیغمبر کی زبان سے اس باب میں ایک آخری اور فیصلہ کن اعلان کرا دیا کہ مجھ سے بحث کرنی ہے تو اس چیز پر کرو جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور جس کا داعی ہوں۔ ان چیزوں پر کیوں جھگڑتے ہو جن کا میں نے سرے سے کوئی دعوے ہی نہیں کیا؟ اگر میرے پاس خزانے نہیں ہیں تو میں نے کب کہا کہ میرے پاس خزانے ہیں؟ اگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ تم پر عذاب کب آئے گا یا قیامت کب آئے گی تو میں نے کب دعوے کیا کہ میں غیب جانتا ہوں؟ اگر میں فرشتہ نہیں ہوں تو میری زبان سے کب نکلا کہ میں فرشتہ ہوں؟ میں تو اس وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھ پر آتی ہے اور اسی کی دعوت تمہیں دے رہا ہوں۔ آخر میں ارشاد ہوا کہ ان سے پوچھو کہ اگر یہ ذرا بھی سوچنے سمجھنے والے ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا خدا کے ہاں اندھے اور بینا یعنی آنکھیں کھول کر چلنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے اندھے ہو کر چلنے والے یکساں ہو جائیں گے؟ کیا اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے والے اور اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر زندگی گزارنے والے برابر ہو جائیں گے؟ کیا نیکوکار اور بدکار دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور بالبداہت نفی میں ہے تو یہی سورج سے زیادہ بدیہی حقیقت وہ وحی تمہارے سامنے پیش کر رہی ہے جس کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں تو اس پر تمہارا یہ معارضہ کیا معنی رکھتا ہے کہ میں تمہیں کوئی نشانی عذاب کیوں نہیں دکھاتا؟ میں آج تمہیں عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھاتا تو کیا اس سے جزا اور سزا کا وہ قانون باطل ہو گیا جس کی میں منادی کر رہا ہوں۔ خدا کے بندو، تم اس پر غور نہیں کرتے۔؟

ہم سے طلب فرمائیے

• تالیف: **التکمیل فی اصول التاویل**

مولانا حمید الدین فراہیؒ

• طبع کردہ: دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ۔ بڑا سائز، کاغذ عمدہ سفید، صفحات ۸۲

طباعت ٹائپ۔ قیمت: ساڑھے تین روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کوثر روڈ۔ اسلام پورہ، لاہور۔!

ہم سے طلب فرمائیے:

تصانیف مولانا فراہیؒ

تفاسیر

دلائل النظام (عربی) سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۳۲
کاغذ عمدہ سفید — قیمت: ۴/۵۰ روپے

مقدمہ تفسیر نظام القرآن (اردو ترجمہ)	قیمت ۰/۵۰ "
تفسیر بسم اللہ و سورۂ فاتحہ	" ۰/۴۵ "
تفسیر سورۂ ذاریات	" ۱/۳۰ "
" سورۂ تحریم	" ۰/۷۰ "
" " قیامہ	" ۰/۴۰ "
" " مرسلات	" ۰/۹۰ "
" " عبس	" ۰/۷۰ "
" " والشمس	" ۰/۵۰ "
" " والتین	" ۰/۷۰ "
" " والعصر	" ۰/۴۰ "
" " فیل	" ۱/۰۰ "
" " کوثر	" ۱/۱۰ "
" " کافرون	" ۰/۴۵ "
" " لہب	" ۰/۷۰ "
" " اخلاص	" ۰/۴۵ "
اقسام القرآن	" ۱/۳۰ "
ذبیح کون ہے؟	" ۱/۷۰ "

لغت و ادب

* اسباق النحو
حصہ اول: ۱/۴۰ روپے
حصہ دوم ۱/۰۰ "

* امثال آصف الحکیم
قیمت: ۱/۳۵ روپے

* جمہرۃ البلاغہ
قیمت: ۱/۵۰ روپے

* مفردات القرآن
قیمت: ۱/۴۰ روپے

* دیوان عربی
قیمت: ۱/۵۰ روپے

* نوائے پہلوی
(دیوان فارسی)
قیمت: ۴/۰۰ روپے

دار الاشاعت الاسلامیہ، اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور ۲ — فون نمبر ۶۹۵۲۲

افاداتِ فراہیؒ
خالد مسعود

جبر و اختیار کا مسئلہ

جبر و اختیار کی بحث مسلمانوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس مسئلہ میں یہود و نصاریٰ نے بھی اختلاف کیا ہے اور ان کے درمیان اس پر طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ فلاسفہ، خواہ دین کے ماننے والے رہے ہوں یا دین کے منکر، وہ بھی اس مسئلہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع پر عقلی و نقلی دونوں پہلوؤں سے بحث کی جائے۔

جبر و اختیار کے معنی

انسان مجبور پیدا ہوا ہے یا مختار؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر جبر اور اختیار کے معانی متعین کرنا ضروری ہے۔ جبر اور اختیار دونوں افعال کی صفتیں ہیں۔ وہ افعال جو کسی سابقہ ارادہ کے تحت صادر نہ ہوں، اضطراری کہلاتے ہیں اور وہ جو ارادہ کے نتیجہ کے طور پر اور اس کی موافقت میں واقع ہوئے ہوں، اختیاری کہلاتے ہیں۔ گویا ارادہ جبر و اضطرار کی ضد ہے۔

فعل اور ارادے میں تعلق

انسان ایک ذی ارادہ ہستی ہے۔ ارادہ اس کی طبیعت و اخلاق کے تابع اور انہی سے مطابقت رکھنے والے امور سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک سخی آدمی اپنی طبیعت اور اخلاق کے تقاضے سے کسی محتاج کو عطا کرتا ہے۔ اس کے اس عمل کو جبر نہیں کہا جاتا۔ کبھی انسان برائی کی عادت ڈال لیتا ہے تو ڈرا دھمکا کر اس کی اصلاح ضروری ہو جاتی ہے۔ انسان کی طبیعت میں ایک طرف اختیار اور نیکی و بدی کا الہام ودیعت کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کے اندر خواہشات کی طرف میلان رکھا گیا ہے۔ لیکن اس پر حاکم اس کا اپنا دل ہے اور اس کا نفس بالکل خود مختار ہے۔ طبیعت کا یہی اختیار ارادے کو وجود میں لاتا ہے اور طبیعت کا رخ ارادے کے رخ کو متعین کرتا ہے۔ ارادے کے تابع افعال جبر نہیں ہو سکتے اور نہ مجبورانہ فعل، فعل کہا جا سکتا ہے۔

رہی ارادے کی حقیقت، تو عام رائے یہ ہے کہ ارادہ کسی دوسرے ارادے کے تابع نہیں اور اگر اس کو تابع مانا جائے تو تسلسل لازم آتا ہے اور یہ عین جبر ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے لئے خیر کو اختیار کرے۔ جو شخص شر کو اختیار کرتا ہے وہ یا تو نادانی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے یا غفلت کے سبب سے۔ اسی لیے تعلیم و تنبیہہ لازم قرار پائی۔ پس اگر انسان کو مجبور بھی فرض کیا جائے تو یہ مجبور خیر کو اختیار کرنے پر ہے۔ پھر ہمارا دعوٰی یہ بھی ہے کہ ارادہ خواہ کسی سابقہ ارادہ کے نتیجہ میں نہ بھی پیدا ہوا ہو بلکہ ایک حادث امر ہو جب بھی اس سے پہلے کوئی نہ کوئی امر لازماً پیش آتا ہے اور ہماری نگاہ اس امر پر بھی ہونی چاہیئے۔

جو لوگ علمِ باری تعالیٰ کی بنا پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ برائی کرنے والے قابلِ ملامت نہیں کیونکہ ان کے لئے برائی کا فیصلہ تو لکھ دیا گیا ہے، وہ فعل کے اسباب کو بھول جاتے ہیں۔ باری تعالیٰ کا علم محض فعل تک محدود نہیں بلکہ اس فعل کے اسباب و علل کے سلسلہ کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی فعل کرنے والے کا ارادہ بھی ہے۔ خدا یہ بھی جانتا ہے کہ ارادہ صاحبِ اختیار نفس کی جانب سے وجود میں آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نفس اس پر مجبور تھا تو ہم کہیں گے کہ ارادۂ بد اور فعلِ بد کے سلسلہ سے نفس کی مجبوری نہیں بلکہ عدم مجبوری ثابت ہوتی ہے۔ ایسا کہنے والے لوگ نفس کو جامد اشیاء پر قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ جامد اشیا کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ اور جبر و اختیار کا سوال صرف ذی ارادہ مخلوق کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ علم نفسیات کے احوال مرتب کرنے کے لئے جو لوگ نفس کو جامد پر قیاس کر لیتے ہیں وہ حقیقت میں نفس کے خاصہ — یعنی فعل، ارادہ اور اختیار — کی نفی کر دیتے ہیں۔

جبر کا فلسفہ ایک مفروضہ ہے

جبر کے قائل ایک تو وہ فلاسفہ ہیں جو روح کے منکر ہیں، دوسرے وہ اہلِ دین ہیں جو تقدیر کو مانتے یا قدرتِ باری تعالیٰ کے محیط ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں جبر کو مستلزم نہیں کیونکہ علم، فعل یا قدرت کا نام نہیں اور خدا اس بات پر قادر ہے کہ اپنی کسی مخلوق کو اختیار اور قدرت عطا کر دے۔ پس کسی اعتبار سے یہ مسئلہ واضح یقینی امور میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے اس کی بدولت مسلّمہ یقینیات کو منہدم کرنا درست نہیں۔

علم کے اصول میں سے ایک مضبوط ترین اصول یہ ہے کہ مفروضوں میں سے صرف انہی مفروضوں کو تسلیم کیا جائے جن سے اشکالات حل ہوں نہ کہ ان سے مزید اشکالات اٹھ کھڑے ہوں۔ جبر کا مفروضہ ایک طرف مدح و ذم اور قوانین و شرائع کی بنیاد ڈھا دیتا ہے اور دوسری طرف باری تعالیٰ کے

بارے میں ہمارے یقین کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ ہمارا یقین یہ ہے کہ ہمارا معبود کریم و رحیم ہے اور یہ بات انتہائی قبیح اور عملاً محال ہے کہ وہ شر کی طرف لوگوں کو خود مجبور کرے، پھر خود ہی انہیں ملامت کرے اور ناراضگی ظاہر کرکے ان کو سزا دے۔ جبر کے عقیدہ سے خدا کے بارے میں یہ حسن ظن ختم ہو جاتا ہے۔

اشاعرہ کے نقطہ نظر پر بحث

اشاعرہ کا قول ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی گناہ کے بغیر بندوں کو عذاب دے، وہ لوگوں کے کسی سابقہ گناہ کے بغیر بھی ان کو کسی ایسے کام پر مجبور کر دیتا ہے جو ان کو عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس قول سے عقل اور خدا کے بارے میں حسن ظن دونوں چیزیں ابا کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کے ساتھ ان کی کسی سابقہ نیکی کے بغیر بلا استحقاق احسان کا سلوک کرنا بہت اچھا ہے مگر جرم کے بغیر سزا دینا یا جرم پر کسی کو مجبور کرنا ایک صریح ظلم ہے جس سے اللہ سبحانہ' بلند ہے۔ اشاعرہ کے اس قول کی نفی قرآن مجید کی واضح آیات سے ہوتی ہے۔ مثلاً متعدد موقعوں پر یہ آیت آئی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے) اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات جائز ہوتی تو قرآن مشرکین کے خلاف یہ دلیل نہ لاتا کہ وہ ابتدائے آفرینش میں خدا کی توحید کا اقرار کر چکے ہیں اور توحید انسانوں کی فطرت میں ہے اور اسی پر ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

(اعراف ۱۷۲-۱۷۴)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں انہوں نے کہا کیوں نہیں، ہم اس پر گواہ ہیں۔ یہ اقرار اس لئے ہوا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے بے خبر تھے یا یہ نہ کہو کہ ہمارے آباء نے پہلے شرک کیا، ہم ان کے بعد ان کی اولاد میں تھے، تو کیا اب تو ہمیں اس کام کی بدولت ہلاک کرے گا جو اہل باطل کرتے رہے

اگر جرم کے بغیر ہلاک کرنا جائز ہوتا تو مذکورہ دلیل کے پیش کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوتا کہ ہم چونکہ تمہیں ہلاک کرنا چاہتے ہیں اس لیے عذاب دے رہے ہیں۔ تمہیں

یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہماری مرضی کے معاملے میں کوئی سوال کرو۔

اشاعرہ کا ایک اور استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے یہ جانتے ہوئے کہ فلاں شخص کافر مرے گا اور دوزخ میں ہمیشہ رہے گا، اس کے اس شخص کو پیدا کرنے میں کوئی خیر نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے علم میں یہ بات ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ کفر پہ مجبور ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کے قدیمی علم کی بدولت جبر کو لازم سمجھنا باطل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ کافر مرنے والے لوگوں کو پیدا کرنا خیر سے خالی ہے تو اس امر سے خدا کے فعل کے خیر ہونے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اس نے ہر چیز کسی حکمت و خیر ہی کے لیے پیدا کی ہے۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ کسی فعل خاص میں بہت خیر ہوتا ہے تاہم یہ لازم نہیں ہوتا کہ تمام مخلوق کے لیے اس میں خیر ہو۔ اللہ تعالےٰ کا علم اپنی مخلوقات کے ہر خیر پر حاوی ہے لیکن ہم اس کے کل یا جزو سے ناواقفیت رکھتے ہیں۔ مگر ایک سے سے ناواقفیت کو اس کے وجود سے انکار کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھی کے واقعہ میں دیکھیئے کہ جب حضرت موسیٰؑ پر اپنے ساتھی کے افعال کی حکمت واضح نہ ہوئی اور انہوں نے علی سبیل الانکار ان کی بابت سوال کیا تو ان کے ساتھی نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا ہے بلکہ پہلے فعل کی حکمت بیان کی، پھر بتایا کہ میں نے خدا کے حکم سے ایسا کیا۔

مسلمانوں میں جبر کا عقیدہ پھیلنے کے اسباب

مسلمانوں کے جن فرقوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن صراحت کے ساتھ جبر کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کو بعض آیات کے معانی اور موقع و محل کو سمجھنے میں مشکل پیش آئی ہے۔ ان کے خیال میں یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) اور یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) قسم کی آیات جبر کی صریح دلیل فراہم کرتی ہیں، نیز اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے) کی رو سے چونکہ ہر چیز کی تقدیر لکھی ہوئی ہے اور ہمارے اعمال بھی اسی ذیل میں آتے ہیں لہٰذا مقدّر میں کسی کا اختیار نہیں چلتا۔

قرآن مجید کی آیاتِ مشیّت پہ غور کرنے سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ مالک الملک ہے، وہ اپنے ارادے کو پورا کر سکتا ہے اور اس کی مشیت کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس سے قرآن کا مقصود خدا کی عمومی قدرت کا بیان اور شرکاء اور باطل شفعاء کی نفی کا اظہار ہے۔ پھر قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کی رحمت و نعمت ہر چیز کو محیط ہے۔ پس

(بقیہ ص ۶۲ پر)

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست

عورتوں کے حقوق و فرائض

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عاید ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بحیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے حقوق و فرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے۔ یہ اختلاف جن حقیقتوں پر مبنی ہے ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

مغربی نظریہ مساوات اور اسلام

اسلام مساواتِ مرد و زن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام جس مفہوم میں عورت و مرد کی مساوات کا داعی ہے وہ یہ ہے کہ جس نفس واحدہ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کیا ہے اسی نفس واحدہ سے عورت کو بھی پیدا کیا ہے۔ جس طرح مرد اس نظام کائنات کا ایک ضروری عنصر ہے اور قدرت نے ایک خاص مقصد سے اس کو تخلیق کیا ہے اسی طرح عورت بھی اس کائنات کی مشین کا ایک ضروری پرزہ ہے اور قدرت نے اس کی تخلیق سے بھی ایک ضروری غرض وابستہ کی ہے۔ جس طرح مرد قدر و احترام کا مستحق ہے اسی طرح عورت بھی قدر و احترام کی حق دار ہے۔ جس طرح مرد کچھ خاص قابلیتیں اور قوتیں لے کر آیا ہے اسی طرح عورت بھی کچھ مخصوص قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوئی ہے۔ جس طرح مرد اپنے کچھ خاص جذبات و عواطف اور کچھ فطری مقتضیات و مطالبات رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنے کچھ خاص رجحانات و میلانات اور کچھ فطری مطالبات و مقتضیات رکھتی ہے۔ اس لئے عورت اور مرد کو اپنے اپنے فطری رجحانات و میلانات کے مطابق سورج اور چاند کی طرح اپنے اپنے دائروں میں قدرت کے منشا کی تکمیل میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ معاشرے کے اندر دونوں پر ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں ہونی چاہئیں اور ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کو حقوق ملنے چاہئیں۔

معاشرے میں عورت و مرد کی مساوات کا اعلان قرآن مجید ان واضح الفاظ میں کرتا ہے :-

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۱- نساء)

اے لوگو! اپنے اس خدا سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور پیدا کی اسی سے اس کی بیوی اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سارے مرد اور بہت ساری عورتیں۔

اس آیت نے عورت کی کمتری اور حقارت سے متعلق ان تمام تصورات کا خاتمہ کر دیا جو قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں پائے جاتے تھے۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ جس نفس واحدہ سے مرد وجود میں آیا ہے اسی سے عورت بھی وجود میں آئی ہے اور جس طرح انسانی معاشرہ کا ایک اہم رکن مرد ہے اسی طرح معاشرے کی دوسری اہم رکن عورت ہے۔ معاشرے کا وجود، اس کا بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ جہاں تک عورت و مرد کی خصوصیات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ صلاحیتیں لے کر آتے ہیں۔ لیکن اس فرق کی وجہ سے ان میں سے کسی کے لئے بھی نہ اپنی ان خصوصیات پر مغرور ہونا یا ان کے سبب سے اپنے کو حقیر سمجھنا زیبا ہے اور نہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنا جائز ہے۔ فرمایا:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۲- نساء)

اور اللہ نے عورت و مرد میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت دی ہے اس کے لئے ارمان نہ کرو، مرد حصہ پائیں گے اس میں سے جو وہ کمائی کریں گے۔ اور عورتیں حصہ پائیں گی اس میں سے جو وہ کمائی کریں گی۔ اللہ سے اس کی بخشش میں سے حصہ مانگو، اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات صاف ہو گئی کہ قدرت کی طرف سے جو خصوصیات عورت و مرد کو عطا ہوئی ہیں ان میں فضیلت کا پہلو کسی ایک ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس فضیلت میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ عورت و مرد دونوں کی سعادت و کامیابی اس بات میں ہے کہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنے کے بجائے ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی نعمتوں کے لئے شکر گزار رہے۔ اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے۔

اس حقیقت کی ایک بہت بڑی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ اسماء بنت یزید انصاریہ ایک مشہور دیندار اور عقل مند صحابیہ اور مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل رض کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ مجھے عورتوں کی ایک جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے جو سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں عرض کرنے آئی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میں آپ سے عرض کر رہی ہوں۔ عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے رسول بنا کر

بھیجا ہے۔ چنانچہ ہم آپ پر ایمان لائیں اور ہم نے آپ کی پیروی کی۔ لیکن ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والی اور گھروں کے اندر بیٹھنے والی ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش نفس پوری کرلیں اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت، جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے گھر بار کی حفاظت کرتی ہیں اور ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں تو کیا اجر میں بھی ان کے ساتھ ہم کو حصہ ملے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہ رضؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے ان سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے جس نے اپنے دین کی بابت سوال کیا ہو؟ تمام صحابہ رضؓ نے قسم کھاکے اقرار کیا کہ نہیں یارسول اللہ۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماء رضؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، اے اسماء میری مدد کرو اور جن عورتوں نے تم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ان کو میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے جو تم نے بیان کئے ہیں۔ حضرت اسماء رسول اللہ صلعم کی یہ بات سن کر خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔[1]

معاشرتی نظام میں مرد کو عورت پر ترجیح حاصل ہے

جہاں تک معاشرتی و اجتماعی دائرہ میں مرد و زن کی کامل مساوات کا تعلق ہے، قرآن اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ عورت بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حقوق رکھتی ہے اور اس کے حقوق بھی اسی طرح قطعی اور واجب الادا ہیں جس طرح مرد کے حقوق قطعی اور واجب الادا ہیں لیکن معاشرتی نظام میں وہ مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے اور اس ترجیح کو نظام معاشرت میں توازن قائم رکھنے کے لئے ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ خاندان کی کفالت کا اصل بوجھ مرد اٹھاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس ذمہ داری کی زیادتی کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہو۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲۲۸ البقرہ)	اور عورتوں پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق ان کے حقوق بھی ہیں البتہ مردوں کے لئے ان کے اوپر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔

اس ترجیح کی نوعیت اور اس کے وجوہ کو دوسرے مقام میں یوں واضح کیا ہے کہ چونکہ خاندان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی قابلیت اللہ تعالیٰ نے مرد ہی میں رکھی ہے اور اس بنا پر بیوی بچوں کے نفقہ کا قانونی ذمہ دار مرد ہی ہے عورت نہیں ہے۔ اس لئے مرد ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو عورت کا قوام اور سردار بنایا جائے۔ فرمایا۔

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر ج ۲ ص ۷۰۶

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

(۳۴- نساء)

اور مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بعض اعتبارات سے ترجیح دی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے۔ پس نیک بیبیوں کو سزاوار ہے کہ فرمانبرداری کرنے والی اور رازوں کی حفاظت کرنے والی بنیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے اس چیز کی حفاظت کی ہے۔

اجتماعی ذمہ داریاں اور عورت

عام معاشرتی فرائض میں بھی اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا ہے اور عورت کو ذمہ داریوں سے الگ رکھا ہے اگر ناگزیر حالات میں کوئی بوجھ اس پر ڈالا بھی ہے تو اس کے فطری ضعف کا اعتبار کرکے اس کسر کا جبر بھی جیسا کیا ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (۲۸۲ بقرہ)

اور گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو، اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا سکے۔

اسلام معاشرت و تمدن کی اجتماعی سرگرمیوں کے جھمیلوں سے عورت کو الگ رکھنا چاہتا ہے اس لئے کہ ان میں اس کی شرکت خود ان کاموں کے لئے بھی ضرر رساں ہے اور ان اہم مقاصد کے لئے بھی نقصان دہ ہے جو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ صرف عورتوں کے ہاتھوں ہی انجام پا سکتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسلامی شریعت کی رو سے عورت نماز میں مردوں کی امام نہیں ہو سکتی اور اگر کسی مرد کی اقتدا میں وہ نماز ادا کرے تو اس کے لئے بھی بعض شرطیں ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے۔ اس حکم کی وجہ عورت کی کمتری یا مرد کی فضیلت نہیں ہے بلکہ یہ سرتاسر اسلام کے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے۔ عورت کی فطری و جنسی خصوصیات اور مرد کے جنسی ہیجانات کی وجہ سے عورت کی امامت میں یہ کھلا ہوا اندیشہ ہے کہ نماز کا وہ اخلاقی و روحانی مقصد ہی فوت ہو جائے جس کے لئے نماز فرض کی گئی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اسلامی قانون کی رو سے عورت مجسٹریٹ اور جج وغیرہ بھی نہیں بن سکتی[1] بعض فقہا نے اگر اس کی اجازت دی بھی ہے تو بہت سے مستثنیات اور شرائط کے ساتھ۔ اس کی بنیاد بھی عورت کی حقارت پر نہیں ہے۔ بلکہ ان مناصب کی ذمہ داریوں اور فرائض کے لحاظ پر ہے جو فطرت نے خاص طور پر عورتوں سے وابستہ کئے ہیں۔ عورت کی

[1] نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۴۰

امارت کے متعلق خود حدیث میں یہ تصریح ہے :-

عن ابی بکرۃ قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ

(رواہ احمد البخاری والنسائی والترمذی وصححہ)

ابوبکرہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلعم کو یہ معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنایا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے حوالہ کر دی ہے۔

یہی روایت بخاری میں ایک اور پہلو کی وضاحت کے ساتھ آئی ہے :-

عن ابی بکرۃ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امرۃ

(بخاری کتاب النبی الی کسریٰ)

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ ایک بات جو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنی تھی اس نے مجھے جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا جب کہ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل کے ساتھ شریک جنگ ہو جاؤں۔ وہ بات یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنے تخت پر بٹھایا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فائز المرام نہیں ہو سکتی جو اپنی حکومت ایک عورت کے سپرد کر دے۔[1]

فوج میں عورتوں کی شرکت کی نوعیت

فوج میں عورتوں کی شرکت کی بعض مثالیں اگرچہ احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ کبھی کبھی بعض عورتیں اپنے شوہروں یا دوسرے عزیزوں کی معیت میں اسلامی فوج کے ساتھ نکلی ہیں۔ لیکن اس نکلنے کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ مدافعت یا جہاد میں حصہ لینا عورتوں پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح مردوں پر فرض ہے۔ اسلام میں فریضہ جہاد اصلاً و اولاً مردوں کے لئے مخصوص ہے اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو براہ راست جہاد میں حصہ لینے کی نہ کبھی دعوت دی نہ کبھی ان کی شرکت پر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ عرب کے دستور کے مطابق اگر کچھ خواتین اپنے شوہروں اور عزیزوں کے ہمراہ کبھی نکل پڑیں تو ان کو مریضوں کی تیمارداری، زخمیوں کی مرہم پٹی، کھانا پکانے اور اس قسم کی خدمات میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا اور مال غنیمت میں سے بھی بطور حصہ کے نہیں بلکہ بطور عطیہ کے ان کو کچھ دے دیا گیا۔ لیکن نہ تو عورتیں اپنے عزیزوں کے بغیر کبھی ان غزوات میں نکلیں نہ ان کو کبھی جنگ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی نہ براہ راست جنگ میں حصہ لینے کا ان کو موقع دیا گیا، نہ مال غنیمت میں ان کو بحیثیت حصہ دار کے

[1] جنگ جمل میں فوج کی اصلی قیادت درحقیقت حضرت عائشہ کر رہی تھیں۔ ابوبکرہ کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے۔

شریک کیا گیا اور نہ جنگوں میں ان کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چند صحیح احادیث ملاحظہ ہوں:

عن عائشة انها قالت يا رسول الله نرى الجهاد افضل العمل افلا نجاهد قال لا لكن افضل الجهاد حج مبرور (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یا رسول اللہ ہم جہاد کو سب سے زیادہ افضل عمل سمجھتے ہیں تو کیا ہم جہاد نہ کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تمہارے لئے سب سے افضل جہاد حج مقبول ہے۔

بخاری میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جهاد كن الحج (تمہارا جہاد حج ہے)

ام ورقہ بنت نوفل کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بدر میں شرکت کی اجازت مانگی تو آپ نے ان کو اجازت نہ دی۔ وہ قرآن کی عالمہ تھیں۔ انہوں نے اس بات کی اجازت مانگی کہ ان کو نماز اور تعلیم قرآن کے لئے اپنے گھر میں عورتوں کو جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محلہ کی عورتیں ان کے ہاں جمع ہوتیں اور وہ ان کی امامت کرتیں[1]

پردہ کے احکام نازل ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حوصلہ شرکت جہاد کے خلاف ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا تھا تاکہ یہ لے بڑھنے نہ پائے۔ چنانچہ غزوہ خیبر سے متعلق یہ روایت ملتی ہے۔

عن حشرج بن زياد عن جدته ام ابيه انها خرجت مع النبي صلى الله عليه وسلم غزوة خيبر سادس ست نسوة فبلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم فبعث الينا فجئنا فرأينا في وجهه الغضب فقال مع من خرجتن و باذن من خرجتن فقلنا يا رسول الله خرجنا نغزل الشعر و نعين في سبيل الله و معنا دواء للجرحى و نناول السهام و نسقي السويق فقال قمن فانصرفن حتى اذا فتح الله عليه خيبر اسهم لنا كما اسهم للرجال

حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ غزوہ خیبر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلیں۔ پانچ عورتوں کے ساتھ چھٹی وہ بھی تھیں۔ کہتی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے نکلنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ہمیں بلوا بھیجا، ہم حاضر ہوئیں تو ہم نے آپ کو غضب ناک پایا۔ آپ نے پوچھا۔ تم کس کے ساتھ نکلیں اور کس کی اجازت سے نکلیں؟ ہم نے جواب دیا یا رسول اللہ ہم چل آئی ہیں، اون کاتتی ہیں کچھ اللہ کا کام کرتی ہیں۔ ہمارے ساتھ زخمیوں کے لئے کچھ مرہم پٹی کا سامان بھی ہے۔ ہم تیر پکڑا دیں گی۔ ستو گھول کے پلا دیں گی۔ آپ نے فرمایا۔ چلو واپس جاؤ۔ پھر جب اللہ نے خیبر فتح کرا دیا تو آپ

[1] ابو داؤد۔ باب امامت النساء

فقلت لها يا جدة وما كان ذلك قالت تمرا (احمد و ابوداؤد)

نے ہم کو مردوں کی طرح حصہ دیا[1]۔ حشرج کہتے ہیں: میں نے پوچھا کہ دادی کیا چیز ملی تو فرمایا کھجوریں۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ کی نوعیت

صدر اول کی پوری تاریخ میں عملی سیاست میں کسی عورت کے حصہ لینے کی اگر کوئی قابل ذکر مثال ملتی ہے تو وہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی ملتی ہے۔ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضؓ کے خون کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علی رضؓ سے ان کی وہ جنگ ہوئی جسے جنگ جمل کہتے ہیں۔ اس جنگ میں حق پر کون تھا اور کس سے اجتہاد کی غلطی صادر ہوئی اس امر سے اس موقع پر بحث نہیں ہے۔ ہم صرف اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے اس معاملہ میں پڑنا ام المومنین کے لئے صحیح تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق متعدد صحابہ اور صحابیات کی رائیں رجال و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن چونکہ وہ کسی ایک فریق کی جانب داری پر محمول کی جا سکتی ہیں اس لئے ہم یہاں ان کو نقل نہیں کریں گے۔ البتہ حضرت عمر رضؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضؓ بن عمر کی رائے پیش کرتے ہیں جو دو پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو اس سارے جھگڑے میں غیر جانب دار رہے اور دوسرا یہ کہ ان کے علم و تقویٰ پر کبھی کسی نے حرف رکھنے کی جرأت نہیں کی۔ روایت ہے کہ انہوں نے صاف صاف کہا کہ حضرت عائشہ رضؓ کے لئے اس معاملے میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھتیں۔

ان بيت عائشة خير لها من هودجها[2]

حضرت عائشہ کا گھر ان کے لئے ان کے ہودج سے بہتر تھا۔

حضرت علی رضؓ اس معاملہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ ان کی رائے کو زیادہ وزن نہ دیں لیکن نازک سے نازک حالات کے اندر انہوں نے جس طرح اپنے سخت سے سخت مخالفوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو جانبداری کی رو میں بہنے سے بچایا ہے اور جس طرح قول و فعل دونوں میں حق و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ خود جنگ جمل کے فتنہ میں انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح ام المومنینؓ کے مرتبہ کا انہوں نے لحاظ رکھا ہے اس کی بنا پر وہ حق رکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کی رائے کو ایک فریق کی رائے قرار دے کر نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ دوسرے تمام معاملات میں ان کی رایوں کو جو دینی و شرعی وقعت دی جاتی ہے اسی احترام کے ساتھ اس معاملہ میں بھی ان کی رائے پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کس پہلو سے حضرت عائشہ رضؓ کے اس اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضؓ کو اس بارے میں جو خط لکھا اس کے الفاظ یہ ہیں :-

اما بعد فانك خرجت مغضبة لله

آپ اللہ اور رسول کی حمیت میں ایک ایسے معاملہ کو لے کر اٹھ

---

[1] حصہ سے مراد یہاں مردوں کی طرح مال غنیمت میں حصہ نہیں ہے بلکہ خود ان کے بیان سے واضح ہے کہ کچھ کھجوریں ترغیباً ان کو دے دی گئیں۔ [2] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ص ۵۶

ولرسوله تطلبين امرا كان عنك موضوعا ما بال النساء والحرب والاصلاح بين الناس تطلبين بدم عثمان ولعمري لمن عرضك للبلاء وحملك على المعصية اعظم اليك ذنبا من قتلة عثمان وما غضبت حتى اغضبت وما هجت حتى هيجت فاتقي الله وارجعي الى بيتك

(الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ ص ۶۴)

پڑی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ اللہ و رسول کی جانب سے سبکدوش تھیں۔ عورتوں کو جنگ اور مردوں کے معاملات میں پڑنے سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا مطالبہ لے کر اٹھی ہیں حالانکہ اللہ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کیا اور اس غلطی پر آمادہ کیا انہوں نے عثمان کے قاتلوں سے بڑی برائی آپ کے ساتھ کی۔ آپ دوسروں کے ابھارنے سے غصہ میں آگئی ہیں اور دوسروں کی انگیخت سے آپ میں اشتعال پیدا ہوگیا ہے۔ اللہ سے خوف کیجئے اور گھر کو لوٹ جایئے۔

ملاحظہ فرمایئے، اس خط میں حضرت علی رض نفس معاملہ کے حق یا باطل ہونے پر کوئی بحث نہیں کرتے۔ اور ام المؤمنین سے یہ نہیں کہتے کہ آپ بالکل غلط معاملہ کے لئے اٹھ پڑی ہیں اور اس کے غلط ہونے کے دلائل یہ اور یہ ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنے دوسرے مخالفوں کو لکھا۔ بلکہ ام المؤمنین پر ان کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے معاملے میں براہ راست اور عملی مداخلت کی ہے جس کی ذمہ داریوں سے "ایک عورت ہونے کی حیثیت سے" اللہ اور اس کے رسول نے ان کو بری کیا تھا۔ لیکن محض دوسروں کی انگیخت سے وہ ایک غیر متعلق معاملہ میں پڑ گئی ہیں اور ایک بڑے فتنہ کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو الجھا لیا ہے جس سے بغیر کسی مسؤلیت کے وہ اپنے تیئں علیحدہ رکھ سکتی تھیں۔

ام المؤمنین نے حضرت علی رض کے اس خط کا جو جواب دیا وہ محض اس قدر تھا کہ "اب گلہ شکوہ کا وقت نہیں رہا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رض کے اعتراض کی قوت محسوس کی اور اس سے متاثر بھی ہوئیں لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان کے لئے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینا ناممکن ہو چکا تھا۔ ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس موقع پر اس مختصر جواب پر قناعت کر جاتیں اور حضرت علی رض کے اس دعوے کو چیلنج نہ کرتیں کہ اس طرح کے معاملات عورتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ عورتوں کے حقوق کے لئے زندگی بھر وہ جس طرح لڑتی رہی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رض کی رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود وہ اس کی تردید نہ کریں۔ ان کے تاثر کی شہادت ان کی بعد کی زندگی سے بھی ملتی ہے کیونکہ جنگ جمل کے بعد سیاسی فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا لیکن اس کے بعد سے ام المؤمنین نے اپنی ساری اصلاحی سرگرمیاں عورتوں تک محدود رکھیں۔ نہ صرف یہ کہ کسی عام سیاسی ہنگامہ میں کسی نوعیت سے حصہ نہیں لیا، بلکہ مختلف دلائل و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ جمل کی غلطی پر ان کو مدت العمر پچھتاوا رہا۔

عورت کے مزاج اور ریاست کے مزاج میں فرق ہے

ریاست کے انتظام میں عورت کی براہ راست شرکت سے ریاست کو نقصان

پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور سیاست کے مزاج میں فطری طور پر نامناسبت ہے۔ عورت کے مزاج میں فعل سے زیادہ انفعال، کسر سے زیادہ انکسار اور تاثیر سے زیادہ تاثر کا غلبہ ہے۔ وہ زود حس بھی واقع ہوئی ہے اور شدید التاثر بھی، اس وجہ سے واقعات و حالات سے وہ جلد اثر پذیر بھی ہو جاتی ہے اور اس کا یہ اثر تیز اور شدید بھی ہوتا ہے۔ اس کی یہ فطرت اس کے فطری دائرہ کے اندر جہاں معاملہ صرف اپنوں سے ہے اس کے ذاتی تعلق کے لحاظ سے نہایت موزوں (اور ضروری بھی) ہے اس کے سبب سے وہ متعلقین افراد یعنی شوہر اور اولاد کے لئے سراپا ایثار و محبت بنی ہوئی رہتی ہے۔ ان کی ہر ضرورت اور ہر تکلیف کا وقت سے پہلے احساس کر لیتی ہے اور جب احساس کر لیتی ہے تو اس کے ازالہ کے لئے اس کے اندر ایسی بے چینی اور بے قراری پیدا ہو جاتی ہے کہ جب تک اسے دور نہ کرے اس کو چین نہیں پڑتا اگرچہ اس کے لئے اسے سب کچھ قربان کر دینا پڑے۔

لیکن سیاست کے اندر اس کا یہ مزاج نہ تو خود اس کے مناسب حال پڑتا ہے، نہ ریاست کے۔ اوّل تو حکومت کا مزاج انفعال سے زیادہ فعل، انکسار سے زیادہ کسر اور تاثر سے زیادہ تاثیر کا مقتضی ہے۔ اس کی خصوصیات مردانہ ہیں وہ اپنا ایک متعین ارادہ رکھتی ہے اور اس ارادہ کو ایک فاعلانہ عزم اور آمرانہ زور و قوت کے ساتھ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ ثانیاً اس کے معاملات نہایت پھیلے ہوئے، اپنوں اور بیگانوں ہر ایک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں اس لئے اس کے انصرام میں وہی رویہ زیادہ قرین مصلحت و سیاست ہوتا ہے جس میں جذباتی پن سے زیادہ سکون مزاج اور سرعت و جلد بازی سے زیادہ عزیمت غالب ہو۔ چنانچہ عورت ہی کی کچھ خصوصیت نہیں ہے وہ مرد بھی ریاست کے لئے ناموزوں ہوتے ہیں جو جذباتی اور ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جاتے ہیں تو اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور اور کبھی اوقات سلطنت کو بھی خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

انفعالی عناصر (PASSIVE ELEMENTS) کی زیادتی یوں تو کسی ریاست کے مزاج کے بھی مناسب حال نہیں ہے لیکن ایک اسلامی ریاست تو کسی طرح بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ موجودہ زمانہ کی جمہوری حکومتیں جو عوام کی نمائندہ ہوتی ہیں اور جن کا کام اپنے آپ کو عوام کی پسند کے رنگ میں رنگنا ہے وہ تو ممکن ہے ایک حد تک اس کو برداشت کر لے جائیں لیکن اسلامی حکومت جس کا اصلی مقصد عوام کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کے بجائے لوگوں اور اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگنا اور اس کی مرضی پر چلانا ہے اور صرف کسی ایک دائرہ ہی کے اندر نہیں بلکہ خدا کی پوری زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے وہ مشکل ہی سے اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بھی ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا

لیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جنہوں نے اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی ہے)

فلسفۂ سیاست کا مشہور عالم بلنچلی (BLUNTCHLI) بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE THEORY OF THE STATE) میں لکھتا ہے:

"جن عورتوں نے سیاست میں شہرت پائی ہے انہوں نے عموماً ریاست کو اور اپنے دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی ہوشیاری اور ذکاوت نے ایک سازش کی شکل اختیار کر لی ہے اور جب ایک مرتبہ نفرت، انتقام اور طمع کے جذبات عورت کے سینہ میں بھڑک اٹھے ہیں تو وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے ہیں۔ یہ بات صرف بادشاہوں کی آشناؤں ہی کی حد تک صحیح نہیں ہے بلکہ بہت سی بیویاں اور ماؤں کے متعلق بھی صحیح ہے جو تاریخ میں مشہور ہوئی ہیں۔ روم کی تاریخ، انقلاب فرانس کی سرگزشت، اور شاہان فرانس کے درباروں کے حالات سب سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۹۳)

پچھلی جنگ کے موقع پر فرانس کے لیڈروں نے بھی اس امر کا اعتراف کیا کہ ان کی شکست میں سب سے زیادہ ان عورتوں کا ہاتھ ہے جو سیاست میں دخیل تھیں۔ اسلامی تاریخ کی شہادت اس بارہ میں جو کچھ ہے اس کو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان بنیادی مباحث کو پیش نظر رکھ کر اب آئیے عورت کے حقوق و فرائض پر غور کیجئے:

عورت کے حقوق

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلامی ریاست عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔

—— اسلامی ریاست ہر عورت کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ لے گی۔

—— عورت اپنی ملک ذاتی (PRIVATE PROPERTY) رکھ سکے گی اور ریاست اس کے اس حق کی محافظ ہوگی۔

—— شریعت نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں ریاست اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لئے عورت کو پوری آزادی حاصل رہے۔ رسم و رواج وغیرہ کے قسم کی چیزیں اس کی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

—— عورتوں کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ وہ اپنی انجمنیں بنا سکیں گی، اپنے اخبار اور رسالے نکال سکیں گی، حکومت پر تنقید کر سکیں گی، اپنے اسلامی حقوق کا مطالبہ کر سکیں گی۔ ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار رائے کر سکیں گی۔

—— عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہوگی۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی جائے گی

—— اسلام کے حدود کے اندر مسلک و مذہب اور رائے و خیال کی جو آزادی مردوں کو حاصل ہوگی وہ عورتوں کو بھی حاصل ہوگی۔

—— عورتوں کو قانونی مساوات حاصل ہوگی یعنی عزت و امارت اور شرافت و حقارت کی بنا پر قانون ایک عورت اور دوسری عورت میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

—— نسل و نسب، عزت، و امارت اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر اسلامی ریاست میں کسی کو شریف اور کسی کو کمینہ نہیں قرار دیا جائے گا۔

—— اسلامی بیت المال میں جس طرح مردوں کے حقوق ہوں گے اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہوں گے۔

—— ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہوگی۔

—— جس طرح مردوں کی تعلیم کا ریاست بندوبست کرے گی اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لئے بھی وہ ذمہ دار ہوگی۔

—— بے لاگ، اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لئے ہوگا اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہوگا۔

—— اگر کوئی عورت قرض چھوڑ کر مرے گی اور کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑے گی جس سے وہ قرض ادا کیا جا سکے، تو ریاست اس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔

—— کسی عورت کو اطاعت الٰہی کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

—— ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس پر اعتراض و نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں

ان حقوق کے معاوضہ میں عورتوں پر ریاست سے متعلق مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں:-

سمع و طاعت —— جس طرح مردوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولوالامر کی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت کریں اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کی حد تک اولوالامر کے احکام کی اطاعت کریں۔ اولوالامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہے جبکہ ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

خیر خواہی و ہمدردی —— جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی فرض ہے اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے۔ جو بات ریاست کے لئے نافع ہو اس کو حسبۃً للہ انجام دینے کی کوشش کرے۔ محض ذاتی اغراض و فوائد کے لئے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے۔ جو تجویز مفید ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو بات ریاست کے خلاف مفاد ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے روک سکے تو روک دے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے

کی کوشش کرے۔ اگر اس کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا جانے۔ اپنی تنقید و احتساب میں بھی پوری مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راست بازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے۔

تعاون — عورتوں کے لئے ان کے حالات کے لحاظ سے کارکنانِ ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی:۔

(ا) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود ان کی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی، جو عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطۂ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ اوپر اسماء بنت یزید انصاریہ کا واقعہ ہم نقل کر آئے ہیں کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے سوالات کئے اور پھر آنحضرت صلعم نے کس طرح ان کو اپنا نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا اور انہوں نے عورتوں کو آنحضرت صلعم کے جوابات سے آگاہ کیا اسی طرح شفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ:۔

كان عمر يقدمها في الرأي ويرضاها ويفضلها وربما ولاها شيئا من أمر السوق[1]

حضرت عمرؓ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے تھے ان کی رایوں کو پسند فرماتے تھے ان کو ترجیح دیتے تھے اور بعض اوقات بازار کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے۔

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہوں گے مثلاً زنانہ کالج اور اسکول، زنانہ ہسپتال، زنانہ پولیس، زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ۔ یہ کلیتہً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے۔ اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کی انہیں خود مختاری ہوگی۔

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی بشرطیکہ وہ پردہ کے حدود کے احترام کے ساتھ انجام دی جا سکتی ہوں۔ جو عورتیں اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم و فن میں مہارت اور کسی شعبہ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہنچائیں گی ان کو کام کرنے کا بھی پورا موقع دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

فوجی خدمات —— فوجی خدمات میں براہ راست حصہ لینے اور فوج میں عملی شرکت کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے۔۔۔ لیکن ان کا اسلحہ کے استعمال، ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ، ابتدائی طبی امداد اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے اس لئے حکومت اس کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں، تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو عورتیں بھی ملک و ملت کی مدافعت اور جہاد کے اجر و ثواب میں شریک ہو سکیں۔

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر، ص ۷۴۱

اسرار احمدؒ

اسلام اور امنِ عالم

گذشتہ سال ماہ ستمبر میں مجلس طلبائے اسلام پاکستان نے بمقام بنات الاسلام اکیڈمی، گلبرگ لائل پور، اپنا پہلا سالانہ تربیتی اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس میں اسلام اور امن عالم کے موضوع پر راقم الحروف کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی، اس اجتماع کی عمومی نشستیں تو بعد میں حکام کے امتناعی احکام کے پیش نظر منعقد نہ ہو سکیں۔ البتہ کچھ لائل پور کے مقامی طلبہ اور کچھ باہر سے آنے والے مندوبین اپنے خصوصی اجلاس منعقد کرتے رہے۔ ایسی ہی ایک نشست میں راقم الحروف نے درج ذیل گذارشات پیش کی تھیں جو اب ہدیہ قارئین "میثاق" ہیں۔ ——— (اسرار احمدؒ)

حمد و ثناء، درود و سلام، اور دعا کے بعد :

عزیز طلبہ !

آج آپ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے میں ایک خصوصی مسرت محسوس کر رہا ہوں جس کے دو اسباب ہیں پہلا یہ کہ ابھی خود مجھے طالب علمی کے دور سے گذرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، ۱۹۵۴ء میں میں ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان سے فارغ ہوا تھا اور ایک تو ویسے ہی گذرا ہوا وقت بہت مختصر معلوم ہوا کرتا ہے، چنانچہ قیام قیامت کے وقت لوگ نہ صرف اپنی پوری دنیوی زندگی بلکہ پورے دورِ عالم برزخ کو بھی بس ایک رات یا اس کی صبح جتنا مختصر محسوس کریں گے[1] پھر چودہ سال تو واقعۃً بہت قلیل مدت ہے ——— علاوہ بریں میرا معاملہ تو خاص طور پر یہ ہے کہ میں نے اس پورے عرصے میں بھی اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی محسوس کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب بھی میں خود کو بس ایک طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ شاید آپ یہ جان کر حیران ہوں کہ میں نے آج سے تین سال قبل ایک باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا اور اس میں قطعاً کوئی حجاب محسوس نہ کیا اور آج آپ کے مابین

[1] كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا (والنّٰزعات)

ہیں بالکل عجیب اجنبی کی سی کیفیت محسوس کر رہا ہوں —— آج کے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جو مسرت مجھے حاصل ہوتی ہے اس کا ایک سبب اور بھی ہے، جسے میں اپنی گذارشات کے آخر میں بیان کروں گا۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ مجھے "اسلام اور امن عالم" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ میں اس موضوع پر تین سطحوں (LEVELS) پر گفتگو کروں گا۔ ایک: انفرادی امن، دوسرے: سیاسی، معاشرتی سلامتی اور تیسرے: امن عالم۔

۱۔ انفرادی امن و سکون

آپ شاید حیران ہوں گے کہ امن عالم پر گفتگو اور اس کی ابتداء انفرادی سکون و اطمینان سے! لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں گے تو خود محسوس فرمائیں گے کہ عالمی امن کے قیام میں اصل فیصلہ کن عامل افرادِ نسل انسانی کا انفرادی سکون و اطمینان ہی ہے۔ اس لئے کہ —— ایک: تو پورے عالم انسانی کی اصل اکائی (UNIT) بہرحال فرد ہی ہے۔ ایک فصیل، چاہے کتنی ہی لمبی، چوڑی اور اونچی کیوں نہ ہو وہ بنی تو بہرحال اینٹوں ہی سے ہوتی ہے اور جس طرح اس کی مضبوطی کا سارا دارومدار اینٹوں کی پختگی پر ہوتا ہے اسی طرح امن عالم کا تصور بھی افرادِ نسل انسانی کے داخلی سکون و اطمینان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا —— دوسرے: واقعہ یہ ہے کہ انسان عالم اصغر ہے اور اس کے باطن میں نہ صرف یہ عالم ارضی بلکہ پوری کائنات منعکس موجود ہے۔ اس حقیقت عظمیٰ کو نفسیات انسانی کے سب سے بڑے عالموں یعنی صوفیائے اسلام نے خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ انہی کی اصطلاح کو میں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس بات کو تو عام طور پر سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ انسان کے باطن پر خارج کے اثرات مترتب ہوتے ہیں اور کائنات ارضی و سماوی کے تمام واقعات و حوادث انسان کی داخلی کیفیات پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ تاہم یہ ہے ایک امر واقعہ کہ اس عالم اصغر یعنی انسان کا باطن بھی عالم اکبر یعنی کائنات پر اثر انداز ہوتا ہے اور خارج کی وسعتوں اور پہنائیوں پر عکس ڈالتا ہے۔ لہٰذا نسل انسانی کے افراد کے باطن میں اگر سکون و اطمینان موجود نہ ہوگا تو لامحالہ کائنات ارضی و سماوی پر بھی اس کا عکس پڑے گا اور امن عالم کا قیام ممکن نہ ہو سکے گا —— ۳۔ تاریخ عالم پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو صاف نظر آئے گا کہ بسا اوقات بعض افراد کے داخلی انتشار و فساد کی وجہ سے عظیم خون ریزیاں ہوئیں اور امن عالم تہ و بالا ہوا۔ ہلاکو اور چنگیز خان اور ہٹلر اور مسولینی ایسے لوگوں کی شخصیتوں کا ذرا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے جذبات و احساسات کے اختلال اور ذہنی و قلبی انتشار ہی کے نتیجے میں پورے عالم ارضی کا سکون و چین ختم ہوا، اور بے اندازہ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا —— ۴۔ اس وقت بھی ذرا آنکھیں بند کر کے سوچئے کہ کریملن اور وائٹ ہاؤس میں جو معدودے چند لوگ اقتدار و اختیار کی گدیوں پر قابض ہیں، ان کے داخلی امن و سکون کا کتنا گہرا تعلق عالمی امن کے ساتھ ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی ایک یا چند ایک کے ذہنی اختلال ہی نہیں محض اعصابی تناؤ کی بدولت کتنی ہلاکت خیز

جنگ چھڑ سکتی ہے اور کیسا کچھ خون خرابہ ہو سکتا ہے۔

ایمان | اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی اساس جن بنیادی اعتقادات پر قائم ہے ان کا مجموعی نام ہی "ایمان" ہے۔ جس کا مادہ "امن" ہے اور جس کا اصل حاصل وہ سکون و اطمینان ہے جو اس کی بدولت نفسِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کا اصل الاصول "ایمان باللہ" ہے جو عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ توکل و اعتماد اور تسلیم و تفویض ـ ـ ـ ـ ـ ـ کے ایسے تعلق سے جو انسان کو حقیقی امن و سکون اور راحت و چین سے ہمکنار کرتا ہے اور انسان کے داخلی امن کے لئے ایک مثبت و محکم اساس فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک فردِ نوعِ بشر کا مخلصانہ تعلق جس کا اصطلاحی نام "توحید" ہے۔ بالآخر انسان کو "رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ" کے اس مقامِ رضا پر فائز کرتا ہے جہاں پہنچ کے بعد انسان کو کوئی خوف و خدشہ رہتا ہے، نہ حزن و ملال[1] اور اس کے نتیجے میں انشراحِ اور قلب میں انبساط کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو محسوس تو کی جا سکتی ہے بیان میں نہیں آ سکتی۔

سورۃ الانعام کی آیات ۸۱-۸۲ میں پہلے ایک سوال کیا گیا ہے کہ :-

فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○
اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ امن کا اصل حقدار کون سا فریق ہے ؟

اور پھر جواب دیا گیا ہے کہ :

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ
امن تو بس ان کے لئے ہے جو ایمان لائیں اور اس میں پھر شرک کی کوئی آمیزش نہ کریں۔

غرض ایمان باللہ ــــــ انسان کے داخلی امن کا واحد مثبت ذریعہ ہے اور قلبِ انسانی کو حقیقی امن و سکون سوائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسے مخلصانہ اور مضبوط و محکم تعلق کے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا جس کا ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ :

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○
آگاہ ہو جاؤ کہ قلوبِ انسانی کو تو بس ذکرِ الٰہی ہی سے اطمینان ہو سکتا ہے !

نوعِ انسانی کا جو بدنصیب فرد اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے گا اسے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر لازم ہے کہ اس کی دنیوی خواہشات (WORLDLY AMBITIONS) ہر دم بڑھتی چلی جائیں

---

[1] اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○
آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ حزن۔

اور وہ طولِ امل کے جال میں پھنستا چلا جائے۔ پھر اکثر و بیشتر تو آرزوؤں اور امیدوں کے سراب ہی پر دم توڑ دے اور اگر نسبتاً ذہین تر ہو تو مزید پیچیدہ امراض کا شکار ہو۔ چنانچہ ایک طرف اس کا باطن مختلف اور متضاد خواہشات کے باہمی تصادم کی آماجگاہ ہے جس کے نتیجے میں داخلی انتشار (INTERNAL CONFLICTS) پیدا ہوں اور ناکامیاں و نارسائیاں مختلف النوع مایوسیوں (FRUSTRATIONS) کو جنم دیں اور ان سب کے نتیجے میں انسان کا باطن ایک سلگتی ہوئی بھٹی بنا رہے جس میں اس کے دل و جگر کباب ہوتے رہیں ——— اور دوسری جانب ابنائے نوع کے مفادات کے باہمی تصادم سے جہد للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTENSE) ہی نہیں تکاثر و تنافس اور بغی و طغیان کی صورتیں پیدا ہوں اور خدا کی زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے۔

اس مرحلے پر پھر 'ایمان' ہی کی ایک دوسری شاخ 'ایمان بالآخرت' جو درحقیقت ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے، انسان کا سہارا بنتی ہے اور انسانی بغی و طغیان کی راہ میں ایک موثر رکاوٹ بن کر سامنے آتی ہے اور 'بعث بعد الموت' 'حساب کتاب اور جزا و سزا کے حقائق' کو اجاگر کر کے انسان کو اپنے جائز حقوق پر قانع اور مناسب حدود کا پابند رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ سورۂ علق کی آیات ۶ تا ۸ اگرچہ اولین وحی تو نہیں لیکن بالکل ابتدائی آیات میں سے ضرور ہیں اور ان کو اولین وحی سے بالکل متصل رکھ کر شارع نے ان کی اہمیت کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ ان میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو حد سے تجاوز اور ظلم و تعدی سے باز رکھنے والی قوت ایک ہی ہے اور وہ عقیدہ آخرت ہے' فرمایا گیا :

كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ	کچھ نہیں، انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔
أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ إِنَّ إِلَىٰ	اس لئے کہ پاتا ہے اپنے تئیں آزاد۔ (لیکن) اسے لازماً
رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ	تیرے پروردگار کے پاس لوٹنا ہے۔

میری ان گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ امن کی اساس ایمان ہی پر قائم ہوسکتی ہے اور امن عالم کے قیام کی کوئی سکیم جو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے شروع نہ ہو قطعاً کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اسلام میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان کا اصل تعلق انسان کی باطنی کیفیات سے ہے اور داخلی امن اس کا سب سے بڑا ثمرہ ہے۔ اس داخلی امن کے ظہور خارجی کو اصطلاح میں 'اسلام' کہتے ہیں جو خارجی سلامتی کا مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان جس مثبت اجتماعی کو جنم دیتا ہے اور جو مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست کی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے اس کی اساس اسلام پر ہے نہ کہ ایمان پر۔ لیکن یہ ایک ضمنی بات ہے۔ موضوع زیر بحث کے اعتبار سے اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ایمان و اسلام درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، ایک انسان کے داخلی امن کا مظہر ہے اور دوسرا خارجی سلامتی کا۔ ان عظیم حقائق کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں جو آپؐ ہر نئے ماہ کے چاند کو دیکھ کر پڑھا کرتے تھے، نہایت فصاحت اور بدرجہ بلاغت کے ساتھ سمو دیا ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے :

اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ — پروردگار اس ہلال کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرما (آمین)

انہی حقائق کو آپؐ نے دوسرے مواقع پر پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا: چنانچہ ایک طرف آپ نے اس شخص کے ایمان کی نفی پر تین بار خدا کی قسم کھائی جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو[1]۔ دوسری طرف خلق حسن کو آپ نے ایمان اور اسلام دونوں کی بلند ترین منزلیں قرار دیا[2]۔ تیسری طرف آپ نے مسلمان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ بیان فرمائی کہ "مسلم وہ ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں[3]" اور چوتھی طرف عام ہدایت دی کہ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا[4]۔

سیاسی و معاشرتی سلامتی

افرادِ نسل انسانی کے باہمی میل جول اور ربط و تعلق سے پہلے خاندان، پھر کنبہ اور قبیلہ اور اس سے آگے بڑھ کر معاشرہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں اور چونکہ یہ عالم ارضی بہر حال گنتی کے چند معاشروں اور معدودے چند ریاستوں ہی پر مشتمل ہے اور امن عالم سے مراد ان معاشروں اور ریاستوں کے باہمی پر امن ربط و تعلق کے سوا اور کچھ نہیں، لہٰذا ان معاشروں اور ریاستوں کے داخلی امن و سکون کو امنِ عالم سے بالکل وہی نسبت ہے جو ایک فرد کے داخلی امن یعنی ایمان کو اس کی خارجی سلامت روی یعنی اسلام سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی امن و سکون اور سیاسی عدل و انصاف پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کی اکائی ایک فردِ مسلم ہے اور اس کی جو تعریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور اس کے جو اوصاف آنحضورؐ نے بیان فرمائے ان کو ذہن میں مستحضر کر کے خود غور فرمائیے کہ جس معاشرے کی تعمیر ان اساسات پر ہوا اور جس کے باشندے ایسے امن پسند، سلامت رو اور صلح جو واقع ہوئے ہوں اس میں امن و سلامتی کی کیسی فضا باقی جائے گی۔ اسلامی ہیئت اجتماعیہ کی مثبت اساس "اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ" پر قائم ہے اور اس کا امتیازی نشان یا علَم سلامتی

---

[1] "وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ" قِیْلَ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، قَالَ "اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ!"

[2] ا۔ قِیْلَ اَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" فَقَالَ "خُلُقٌ حَسَنٌ"
۲۔ "اَکْمَلُ الْمُسْلِمِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا"

[3] "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ"

[4] "اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ"

ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دو مسلمانوں کی خالصتہً لوجہ اللہ باہمی محبت کو نیکی کے چوٹی کے اعمال میں شمار فرمایا ہے۔ اور مسلمان معاشرے میں سب سے زیادہ کہی اور سنی جانے والی بات باہم سلامتی کی بشارت اور دعا یعنی "السّلام علیکم" اور "وعلیکم السلام" ہے۔ اسلامی معاشرے کے ان دونوں نمایاں اوصاف کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مبارک میں اس طرح بیان فرمایا ہے :-

"لَن تدخلوا الجنّةَ حتّٰى تُؤمِنُوا ولن تُؤمِنُوا حتّٰى تحابّوا أفلا أدلّكم على شيءٍ إذا فعلتموه تحاببتم أفشُوا السّلامَ بينَكُم"	اے مسلمانو! تم جنت میں ہرگز نہ داخل ہو سکو گے جب تک صاحب ایمان نہ ہو۔ اور ہرگز صاحب ایمان نہیں ہو سکو گے جب تک باہم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، تو کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تمہارے مابین محبت پیدا ہو جائے (وہ یہ ہے کہ) اپنے مابین 'سلام' کا خوب چرچا کرو۔

قربان جائیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ کیسے معجز نما ایجاز کے ساتھ اسلامی معاشرے کی پوری حقیقت از اساس تا کمال کھول کر رکھ دی۔

قرآن حکیم میں سورہ حجرات خاص طور پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے اصول و فروع سے بحث کرتی ہے اور اس میں اسلامی معاشرے اور مسلمان ریاست کے بہت سے اہم اور بنیادی امور بیان ہوتے ہیں۔ میرے لئے یہاں ان سب کا ذکر تو ممکن نہیں، البتہ اس امر کا تذکرہ موضوع زیر گفتگو کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اس میں معاشرتی امن وسکون اور صلح و آشتی کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت باریک بینی کے ساتھ ہدایات دی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف افواہوں کی روک تھام اور جھگڑوں اور مناقشوں کے فوری حل کی سخت تاکید کی گئی ہے اور دوسری طرف تمسخر و استہزاء، تفاخر و تنابز، تجسس و سوءِ ظن اور غیبت و بدگوئی سے احتراز و اجتناب کا بھی نہایت سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ میں آپ سب حضرات سے تاکیداً عرض کرتا ہوں کہ پوری سورۂ حجرات کا بنظر غائر مطالعہ کر کے از خود اندازہ کریں کہ اسلام معاشرتی امن و سکون کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور بغض و نفرت کے تمام اسباب کا کتنی باریک بینی کے ساتھ سدِ باب کرتا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیے ——— تو نظر آتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے ایسے زریں اصول قرآن حکیم میں متعین کر دیئے گئے ہیں کہ جن کی نظیر کسی دوسری آسمانی کتاب میں بھی شاید ہی مل سکے۔ کہیں اور تو اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثلاً

۱۔ تعاونوا على البرّ والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثمِ والعدوان ○	نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔

۲۔ کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (النساء : ۱۳۵)

عدل و انصاف کے علمبردار اور خدا کے گواہ بن کر کھڑے ہو، چاہے اس کی زد خود تمہارے اپنے اوپر پڑے چاہے والدین اور اعزّہ و اقربا پر۔

۳۔ کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۝ (مائدہ ۸)

خدا کے علمبردار اور عدل و انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو۔ اور کسی گروہ کی عداوت تمہیں عدل و انصاف کی راہ سے ہٹانے نہ پائے۔ عدل سے کام لو۔ اسی کو پرہیزگاری سے زیادہ مناسبت ہے!

۴۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ (الحدید ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (شریعت) اتاری۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں شدید حرب و ضرب کی صلاحیت ہے۔ اور لوگوں کے لئے دوسرے منافع بھی ہیں اور (خصوصًا) اس لئے کہ اللہ دیکھ لے کہ کون ہے وہ جو غیب میں رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے (اور عدل و انصاف کے خدائی نظام کو قائم کرتا ہے!)

گویا کہ اسلامی ہیئت اجتماعی کے چار ستون برّ و تقویٰ اور عدل و قسط ہیں۔ اور حیات اجتماعی کا اصل مقصود و مطلوب اور آلات حرب و ضرب کا اصل منشا و مصرف اسلام کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

امن عالم

عالمی امن کے قیام کے لئے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اسلام کے پاس دو اسکیمیں ہیں۔ ایک دیرپا اور مستقل اور دوسری عارضی و عبوری۔ چنانچہ اب میں مختصرًا ان ہی کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

عالم انسانی میں مضبوط و محکم ـــــ اور پائدار و دیرپا امن کے قیام کی صورت تو ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مذکورہ بالا اسلامی معاشرہ اور مسلم ریاست خود وسعت پذیر (EXPAND) ہوں اور رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ انسانوں حتیٰ کہ پوری انسانیت کو اپنے مضبوط حصار امن میں لے کر ہر قسم کے فتنہ و فساد سے مامون و مصئون کر دیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ امن و سلامتی کی اس صراطِ مستقیم کے سوا جو ایمان و اسلام پر مبنی ہے۔ انسان کے لئے سکون اور اطمینان کی کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اور انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انسان نے اس شاہراہ سے ہٹ کر جب کبھی کوئی

دوسری راہ اختیار کی، خدا کی زمین فتنہ و فساد سے بھر گئی :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۞ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۞ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۞ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۞ وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۞ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِى الْبِلَادِ ۞ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۞ (والفجر ۶ - ۱۲)	کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کیا کیا تیرے پروردگار نے عاد کے ساتھ یعنی ستونوں والی قوم ارم کے ساتھ اور قوم ثمود کے ساتھ جو وادیوں میں چٹانوں کو تراشا کرتے تھے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ — جنہوں نے بلاد ارضی میں سرکشی کی اور ان کو فساد سے بھر دیا !

لہٰذا اسلام کا اصل زور (EMPHASIS) تو اس دعوت پر ہے کہ پوری نوع انسانی اپنے خالق و مالک پر ایمان لے آئے اور اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

۱۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِىْ اَنْزَلْنَا (سورۃ تغابن)	پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور (قرآن مجید) پر جو ہم نے نازل فرمایا ہے۔
۲۔ اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا (حدیث نبوی)	اسلام لے آؤ، سلامتی پاؤ گے !
۳۔ اُدْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً	اسلام (اور سلامتی) میں پورے کے پورے اور سب کے سب داخل ہو جاؤ۔
۴۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۞	اللہ کے ہاں تو بس ایک ہی دین مقبول ہے اور وہ ہے اسلام !

اور اس عالم ارضی کے امن و سکون اور سلامتی و اطمینان کا گہوارہ بننے کی اصل صورت یہی ہے کہ پہلے کسی ایک خطے میں صحیح اسلامی معاشرہ اور حقیقی اسلامی ریاست قائم ہو جو ایمان و اسلام کی عالمگیر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہو جس کے نتیجے میں وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۞[1] کی صورت ایک بڑے پیمانے پر دوبارہ پیدا ہو اور اس اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کی حدود پھیلتی چلی جائیں۔ تاآنکہ پورے عالم ارضی میں قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۞[2] کا سماں بندھ جائے اور پورا عالم انسانیت اپنے رحیم و ودود رب کے دامن رحمت کے سائے تلے آ جائے۔

تاہم بحالات موجودہ یہ ایک بہت دور کی بات معلوم ہوتی ہے[3] جب تک یہ آخری صورت نہ ہو، عبوری دور

---

[1] سورہ نصر : "اور تم نے دیکھا لوگوں کو خدا کے دین میں داخل ہوتے ہوئے فوج در فوج"

[2] سورہ واقعہ : (ہر جانب سلامتی ہی سلامتی کا غلغلہ !)

[3] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بھی اسلامی معاشرے اور مسلم ریاست کے پاس پورے عالم انسانی کے لئے دو مشترک اقدار کی بنیاد پر صلح و امن اور محبت و رافت کا پیغام موجود ہے اور اس سے قبل کہ میں آپ کے سامنے ان دو مشترک اساسات کو بیان کروں جن پر قیام امن کے لئے اسلام کی عبوری تجویز مبنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک نظر آپ عالم انسانی کی موجودہ صورت حال پر بھی ڈال لیں اور وقت کے اہم ترین تقاضے کو سمجھ لیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور ذرائع آمدو رفت اور نقل و حمل میں بے پناہ اضافے کی بنا پر پورا عالم انسانی ایک شہر کے مانند ہو کر رہ گیا ہے اور مختلف ممالک کی حیثیت اس کے محلوں سے زیادہ نہیں رہی۔ لیکن فاصلوں کی یہ ساری کمی انسان کے خارج ہی میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ دلوں کے بُعد میں قطعاً کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اور افرادِ نوعِ بشر اور اقوام و ملل عالم کے مابین دوری بلکہ دُوری کی توں قائم ہے۔ اور یہ ایک عجیب مخمصہ ہے جس میں عالم انسانی اس وقت گرفتار ہے کہ حالات کا شدید تقاضا تو یہ ہے کہ انسان باہم ایک دوسرے سے قریب ہوں اور دنیا میں جلد از جلد ایک عالمگیر معاشرہ اور ایک عالمی ریاست (WORLD STATE) قائم ہو جائے۔ لیکن انسان کی تہی دستی اور تنگ دامانی کا عالم یہ ہے کہ ایسی کوئی قدر مشترک اُسے نہیں مل رہی جو مشرق و مغرب کے فاصلے، گورے اور کالے کے امتیاز اور نسلوں اور عقاید و نظریات کے فرق و تفاوت کی خلیجوں کو پاٹ سکے یا کم از کم ایسا پل بن جائے جس پر سے گزر کر ابنائے نوع بشر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو سکیں۔

اس بدلی ہوئی صورت حال ہی کا تقاضا تھا جس کے تحت مرحوم انجمن اقوام عالم LEAGUE OF NATIONS) وجود میں آئی تھی اور انسان کی یہی تہی دستی تھی جس کے باعث وہ ناکام ہوئی۔ لیکن چونکہ تقاضہ نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ موجود تھا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید صورت اختیار کر گیا تھا۔ لہٰذا پھر تنظیم اقوام متحدہ (UNITED NATIONS ORGANISATION) وجود میں آئی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کی اسی تنگ دامانی کے باعث وہ بھی عملاً ناکام ہو چکی ہے اور اگرچہ اس کا ظاہری ٹھاٹھ باٹھ موجود ہے تاہم ہر شخص جانتا ہے کہ درحقیقت وہ UNITED یعنی متحد کی بجائے UNTIED یعنی منتشر اقوام کے زبانی جمع خرچ کا ایک ادارہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے اس اہم تقاضے کا جواب اسلام اور صرف اسلام کے پاس موجود ہے جو دو ایسی مشترک قدروں کا علمبردار ہے جن کی لڑی میں پوری انسانیت کو پرو دیا جا سکتا ہے اور جن کی بنیاد پر مشرقِ بعید کے زرد رو، مغرب بعید کے سرخ و سپید اور افریقہ کے سیاہ فام انسانوں میں بھائی چارہ

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) ۳؎ اگرچہ ایسا صرف ہماری تقویم کی رُو سے ہے اللہ تعالیٰ کی تقویم کے حساب سے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس اور آیہ قرآنی "اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا" کے عین مصداق ہے!— !!

قائم ہو سکتا ہے اور باہمی اجنبیت اور بیگانگت کے احساسات بیدار ہو سکتے ہیں ——— سورۃ حجرات کی ایک ہی آیت میں یہ دونوں مشترک اقدار بھی بیان ہوتی ہیں اور انسانوں کے مابین فرق و امتیاز کی تمام غلط بنیادوں اور عزت و شرف کے باطل پیمانوں کی نفی کر کے فرق و تمیز اور عزت و شرف کی واحد بنیاد بھی واضح کر دی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ	اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے
ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَ	پیدا کیا۔ اور تمہیں شعوب و قبائل میں تقسیم کر دیا تاکہ
قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ	باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو (باقی رہا عزت کا
عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ	سوال تو) تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت
(حجرات آیت ۱۳)	تو وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

گویا دنیا بھر کے تمام انسانوں کے مابین دو وحدتیں مشترک ہیں۔ ایک وحدت خالق اور دوسری وحدت آدم روئے زمین پر جتنے انسان بھی بس رہے ہیں وہ سب خدا کی مخلوق لہٰذا باہم مساوی اور آدم و حوا کی اولاد لہٰذا آپس میں بھائی بھائی ہیں (اَيُّهَا النَّاسُ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا!) ان کے مابین رنگ و نسل اور شکلوں اور زبانوں کا اختلاف صرف باہمی تعارف کے لئے ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی عزت و شرف کی بنیاد نہیں۔ عزت و شرف کا معیار تو ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کا خوف! ——— عزیز فرمایئے یہ باتیں آج کے اس نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی کیسی بعید اور خالص نظری و کتابی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات آپؐ کے بدترین دشمن[1] بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعتاً ان ہی اساسات پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا اور ایک باقاعدہ ریاست کی بنیاد رکھ دی۔

سورۃ حجرات کی محولہ بالا آیت میں جو تین مضامین بیان ہوئے ہیں۔ وہی عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ نساء کی پہلی آیت میں بیان ہوئے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ	اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا
خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا	تمہیں ایک جان سے اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا۔ اور
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَ	پھیلا دیئے انہی سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں اور ڈرتے
نِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ	رہو اللہ سے جس کا واسطہ تم ایک دوسرے کو دیتے

[1] مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلز جس نے آنحضور کی سیرت طیبہ پر نہایت رکیک حملے بھی کئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا کہ اگرچہ انسانی اخوت و مساوات کے مواعظ حسنیٰ کی تو بقول اس کے مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی کمی نہیں لیکن ان اساسات پر ایک انسانی معاشرے کا واقعی قیام صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے!

بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ — رہتے ہو اور رحمی رشتوں سے، بے شک اللہ تم پر نگران و نگہبان ہے!

یعنی وہی تقویٰ کی تعلیم اور وحدت الٰہ و رب اور وحدتِ آدم وحوّا کو ملحوظ رکھنے کی تاکید۔ یہ دو بنیادیں ہر دو انسانوں کے مابین مشترک ہیں۔ چاہے وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، کالے ہوں یا گورے، متمدّن ہوں یا غیر متمدّن، مرد ہوں یا عورت اور چاہے کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی نظریہ و عقیدہ رکھتے ہوں، کسی شکل و صورت کے مالک ہوں اور کوئی سی زبان بولتے ہوں۔ آیت کے دوسرے حصے میں ان ہی دو اساسات کے تقاضوں کو کھول کر بیان کر دیا۔ پہلی اصل کی معرفت کا تقاضہ تقویٰ ہے اور دوسری اصل کا تقاضہ رحمی تعلق کا لحاظ ہے ——— جس کے اعتبار سے آدم وحوّا پر جا کر پوری نوعِ انسانی ایک ہو جاتی ہے[1]

برادرانِ عزیز! ——— یہ ہے قرآن حکیم کی وہ تعلیم جس میں ایک فرد کے داخلی سکون و اطمینان سے لے کر پورے عالمِ انسانی میں پائدار اور محکم امن کے قیام کے امکانات مضمر ہیں۔ اب ذرا ایک جانب اپنی خوش قسمتی کا تصوّر کیجیے کہ آپ اس عالمِ انسانی کا وہ واحد گروہ ہیں جس کے پاس ایسی عظیم الشان تعلیم موجود ہے اور دوسری جانب اس صورت حال کو دیکھیے اور سر دھنیے کہ عالمِ اسلام بھی آج فلسفوں اور نظریوں کے لئے دستِ سوال ان لوگوں کے سامنے دراز کر رہا ہے جو خود ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ آج "دنیا بھر کے مزدورو متحد ہو جاؤ" کا نعرہ بھی عالمِ اسلام میں اس لئے مقبول ہو رہا ہے کہ اس میں بین الاقوامیت کی ایک جھلک تو نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج اس دین کے نام لیوا جس نے ہر قسم کی قوم پرستی (NATIONALISM) کا خاتمہ کیا اور جس کی تعلیم و تربیت کا منتہا کمال یہ تھا کہ قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا اور پورے عالمِ اسلامی اور وقت کی عظیم ترین مملکت کا فرماں روا ایک حبشی النسل سیاہ فام آزاد شدہ غلام کو "سیّدنا" کے خطاب سے یاد کیا کرتا تھا، اپنی مشکلات کا حل ایک نسلی قومیت میں تلاش کر رہے ہیں" ——— اللہ اکبر خود فراموشی ہو تو ایسی! ——— اور قلبِ ماہیت ہو تو اتنی!!

حضرات! چاہے ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کتنی ہی ہچکچاہٹ محسوس ہو، واقعہ یہی ہے کہ قرآن کی تعلیمات سے سب سے زیادہ بعید خود ہم مسلمان ہیں۔ اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قرآن کے فکر کو اجاگر کرنے اور اس کے نورِ ہدایت کو پھیلانے کا کام بالکل ابتدا سے شروع کیا جائے اور پہلے خود مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات

---

[1] قرآن حکیم کا یہ اعجاز پیشِ نظر رہے کہ خولہ بالا دونوں آیتوں میں خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے نہیں بلکہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ سے ہے اس لئے کہ ان میں وہ اساسات اجاگر کی جا رہی ہیں جو پوری نوعِ انسانی میں مشترک ہیں!

سے روشناس کیا جائے اور پھر پورے عالم انسانی میں قرآن کی رہنمائی کو واضح کیا جائے۔

اور چونکہ یہ بنیادی کام صرف ایسے نوجوان طلبہ کے ذریعے ہو سکتا ہے جو جدید علوم و فنون سے بھی آراستہ ہوں اور دینی جذبے اور مذہبی ذہن و فکر سے بھی مسلح ہوں۔ اس لئے میں نے آپ کی اس مجلس میں شرکت کی دعوت کو غنیمت سمجھا اور یہی آج کی اس مجلس میں اظہار خیال پر خصوصی مسرت کا وہ دوسرا سبب ہے جس کا تذکرہ میں نے ابتداء ہی کیا تھا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جس اساسی کام کی ضرورت ہے وہ درحقیقت کچھ ایسے نوجوان طلبہ ہی کے ذریعے انجام پا سکتا ہے جو جدید و قدیم علوم اور قرآن کے علم و حکمت کی تحصیل اور تعلیم و تعلّم کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ان گذارشات کی بنیاد قرآن مجید کے معروضی مطالعے پر رکھی ہے اور اپنی جانب سے کچھ عرض کرنے کی بجائے قرآن حکیم ہی کی چند آیات کے مضمرات کو کھول دیا ہے تاکہ آپ لوگوں پر قرآن کی عظمت آشکارا ہو اور اس کے علم و حکمت کی تحصیل کا جذبہ پیدا ہو سکے ——— اور اگر میری آج کی ان گذارشات کے نتیجے میں آپ میں سے کسی ایک نوجوان طالب علم کے دل میں بھی قرآن کے تعلیم و تعلّم کے لئے زندگی وقف کرنے کا ارادہ پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت سپھل ہوئی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ا

اسلام کی نشاۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

——— اسرار احمد

● مغرب فکر کا ہمہ گیر استیلاء ● بنیادی نقطۂ نظر ● عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش ● مدافعت کی اوّلین کوششیں اور ان کا ماحصل ● علوم عمرانی کا ارتقا ● اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اصلاحی تحریکیں ● تعبیر کی کوتاہی ● احیائے اسلام کی شرط لازم: تجدید ایمان ● کرنے کا اصل کام ● عملی اقدامات اور

مضامین مندرجہ بالا کی تائید و توثیق بعنوان "فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی: سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۵۶ طباعت آفسٹ: قیمت ایک روپیہ

——— شائع کردہ ———

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور فون ۶۹۵۲۲

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

حضرت حارث المحاسبیؒ

صاحب کتاب الرعایہ

۲۲۵ھ
۲۴۳ھ

صاحب موصوف کا پورا نام ابو عبداللہ حارث بن اسد المحاسبی العنزی ہے۔ اگرچہ تمام تذکرہ نگاروں نے انکا ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی کے بہت کم حالات ہمیں معلوم ہو سکے ہیں۔ حسب ذیل مشاہیر تصوف نے اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ ابو نصر سراج متوفی ۳۷۸ھ صاحب کتاب اللمع
۲۔ ابو طالب مکیؒ متوفی ۳۸۶ھ صاحب قوت القلوب
۳۔ الکلاباذی متوفی ۴۱۲ھ صاحب کتاب التعرف
۴۔ السلمیؒ متوفی ۴۱۲ھ صاحب طبقات الصوفیہ
۵۔ ابو نعیم متوفی ۴۳۰ھ صاحب حلیۃ الاولیاء
۶۔ القشیری متوفی ۴۶۵ھ صاحب رسالۂ قشیریہ
۷۔ الھجویری متوفی ۴۷۲ھ صاحب کشف المحجوب
۸۔ شیخ عطارؒ متوفی ۶۲۰ھ صاحب تذکرۃ الاولیاء
۹۔ سہروردیؒ متوفی ۶۳۲ھ صاحب عوارف المعارف
۱۰۔ جامی متوفی ۸۹۸ھ صاحب نفحات الانس

۱۱ - شعرانی متوفی ۹۷۳ھ صاحب طبقات الکبریٰ

۱۲ - داراشکوہ متوفی ۱۰۶۹ھ صاحب سفینۃ الاولیاء

لیکن ان کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ کسی نے بھی درج نہیں کئے۔ چونکہ وہ ایک بلند مرتبہ صوفی ہونے کے علاوہ ایک عالم متبحر یعنی متکلم اور محدث اور مفسر اور فقیہہ بھی تھے اس لیے حسب ذیل علماء اور فضلائے بھی اپنی تصانیف میں ان کا تذکرہ درج کیا ہے :-

۱ - عبدالقاہر بغدادی متوفی ۴۲۹ھ صاحب اصول

۲ - الخطیب البغدادی متوفی ۴۶۳ھ صاحب تاریخ بغداد

۳ - شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ صاحب الملل والنحل

۴ - ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ صاحب وفیات الاعیان

۵ - الذہبی متوفی ۷۴۸ھ صاحب میزان الاعتدال

۶ - الیافعی متوفی ۷۶۸ھ صاحب مرأت الجنان

۷ - السبکی متوفی ۷۷۱ھ صاحب طبقات الشافعیہ

۸ - العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ صاحب تہذیب التہذیب وشرح بخاری

۹ - المناوی متوفی ۱۰۳۱ھ صاحب الکواکب الدریہ

اگرچہ ان علماء نے بھی حالات زندگی پر روشنی نہیں ڈالی مگر ان کے تذکرہ کرنے سے محاسبیؒ کا علمی مقام بخوبی اور بلاشبہ واضح ہو سکتا ہے۔ عبدالقاہر بغدادی نے تو انہیں اپنے زمانے کا نامور اصولی اور متکلم تسلیم کیا ہے۔

ان تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ محاسبی ۱۶۵ھ میں بمقام بصرہ پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کو بعض لوگوں نے مجوسی لکھا ہے بعض نے قدری (معتزلی) اسی لئے محاسبی نے ترکۂ پدری سے دستبرداری اختیار کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو مختلف المذہب افراد ایک دوسرے کے ترکے کے وارث نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ محاسبی نے تمام عمر مفلسی میں بسر کی مگر ترکۂ پدری سے ایک حبہ وصول نہیں کیا۔

تمام دینی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، وغیرہ انہوں نے امام شافعی سے حاصل کیے اور ایک عرصے تک بغداد میں ان علوم کا درس دیا جہاں ان کا شمار مشہور اور مستند علماء میں تھا۔ چونکہ وہ علم کلام میں بھی بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے اور اپنے افکار و نظریات کو اس علم کی روشنی میں ثابت کرتے تھے اس

لیے ظواہر پرستوں کے پیشوا امام احمد ابن حنبل ان کے شدید مخالف ہوگئے۔ امام صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر محاسبی کا درس بھی بند کرا دیا اور ان کی تصانیف کا مطالعہ بھی ممنوع قرار دے دیا۔ چونکہ اس ممانعت کے باوجود طالبان علم محاسبی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اس لیے امام صاحب نے انہیں کوفہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

کچھ عرصے کے بعد انہیں بغداد واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ مگر حنابلہ کی مسلسل مخالفت کی وجہ سے بغداد کے عوام اُن سے بدظن ہو گئے تھے اور وہ خود بھی تنگ نظر فقہا سے عاجز آ گئے تھے اس لئے انہوں نے گوشہ نشینی ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ شاذ و نادر ہی مکان سے باہر نکلتے تھے اور اپنا سارا وقت تصنیف و تالیف، مراقبات و مجاہدات میں بسر کرتے تھے۔ چونکہ اس عالم تنہائی میں وہ اپنا زیادہ وقت محاسبۂ نفس میں بسر کرتے تھے اس لیے وفات کے بعد اُن کے مریدوں نے انہیں المحاسبی کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ تمام تذکروں میں وہ اسی لقب سے معروف ہیں۔

ان کی وفات ۲۴۳ھ میں ہوئی۔ زمانے کی یہ نیرنگی بھی قابل ذکر ہے کہ جب ان کا جنازہ مکان سے نکلا تو قبرستان تک صرف چار آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ان کا سب سے بڑا اور ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنی فکر خداداد سے کام لیا اور "فقیہہ شہر"[1] کو ناراض کر دیا۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ جنازے کے ساتھ اگر صرف چار آدمی تھے تو صاحب جنازہ کی تصنیف کتاب الرعایہ آج بھی لاکھوں آدمیوں کی رہنما بنی ہوئی ہے اور قیامت تک بنی رہے گی۔

جس طرح اُن کی زندگی میں فقہاء نے ان کی بعض تعلیمات پر اعتراض کیا تھا، ان کی وفات کے بعد بھی اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ نے اپنی مشہور تصنیف "تلبیس ابلیس" میں انہیں بڑے شد و مد کے ساتھ ہدفِ مطاعن بنایا ہے۔

لیکن اس مخالفت کے باوجود محاسبی کی تعلیمات کا اثر برقرار رہا اور صوفیوں ہی نے انہیں اپنا مقتدا تسلیم نہیں کیا بلکہ اشاعرہ نے بھی ان کی علمی عظمت کو تسلیم کیا (دیکھو شہرستانی ص۶۴) اور خفیفی جماعت کے صوفیوں نے تو انہیں اُن پانچ شیوخ میں شامل کیا ہے جن کی تعلیمات لائق

---

[1] اقبالؒ کا یہ شعر غالباً خلافِ محل نہ ہوگا:۔

فقیہہ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری ۔۔۔ مگر یہ بات کہ میں چاہتا ہوں دل کی کشاد

اتباع ہیں (دیکھو قشیریؒ اور عطارؒ)

محاسبی کی تعلیمات کا سب سے زیادہ اثر امام غزالیؒ پر مرتب ہوا کیونکہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "احیاء العلوم الدین" میں محاسبی ہی کے عقائد و افکار کو اپنی تعلیمات کا سنگ بنیاد بنایا ہے اور غزالی ہی کے واسطے سے محاسبی کی تعلیمات کا اثر از منۂ وسطیٰ کے نصرانی اور یہودی تصوف پر مرتب ہوا ہے۔

محاسبی کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں، اور یہ بات قرین عقل بھی ہے کیونکہ ان کی ساری عمر تعلیم و تدریس و تصنیف ہی میں بسر ہوئی لیکن اُن کی تصانیف میں سے صرف ستّرہ کتابوں کے قلمی نسخے دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں سے چار قلمی نسخے اب تک زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں:۔

(۱) کتاب الرعایہ فی التصوف، ۲۔ من اناب الی اللہ، ۳۔ پارۂ از کتاب الصبر والرضا، ۴۔ کتاب التوہم۔

ان کی تمام تصانیف میں کتاب الرعایہ ان کا شاہکار ہے۔ اس کتاب کا پورا نام "کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ والقیام بہا" ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ان کی تمام کتابوں سے زیادہ ضخیم اور ان کی تعلیمات تصوف پر پورے طور سے حاوی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں انہوں نے تلقینی اسلوب اختیار کیا ہے یعنی ایک مرید ان سے سوال کرتا جاتا ہے اور وہ ان کے جوابات دیتے جاتے ہیں تاکہ ایک طالب حق وہ طرز حیات اختیار کر سکے جس کی بدولت وہ اُن حقوق کو ادا کر سکے جو بندے کی حیثیت سے اس پر اللہ کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔

تفصیل مضامین کتاب الرعایہ

اس کتاب میں باسٹھ ۶۲ ابواب ہیں اور بعض ابواب میں فصول بھی ہیں۔ شروع میں تین صفحے کا دیباچہ ہے جس میں مسلمانوں کو بالعموم اور طالبان حق کو بالخصوص، احکام الٰہی مندرجۂ قرآن کی طرف دل و جان سے متوجہ ہونے کی تلقین کی ہے۔ مصنفؒ نے اس سلسلے میں قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:۔

" اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ

شہید ط (۵۰-۳۷) بیشک اس (قرآن) میں یقیناً نصیحت ہے اُس شخص کے لیے جو صاحب دل ہو یا جو کان لگا کر (توجہ سے) احکام الٰہی کو سنتا ہو اور (اس کے ساتھ ساتھ) اسے حضوریٔ قلب بھی حاصل ہو یعنی سُننے کے وقت اس کا دل بھی حاضر (متوجہ) ہو۔

اس کے بعد مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے مومنوں کی شناخت ہی یہ ہے کہ وہ ارشاداتِ خداوندی کو غور سے سنتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں اس آیت سے استشہاد کرتے ہیں:۔

"اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۸ (۳۹-۱۸) (اے رسولؐ میرے اُن بندوں کو بشارت دو) جو (قرآن کی) باتوں کو بغور سنتے ہیں پھر اُس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو صاحبانِ عقل و فہم ہیں۔

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ ابواب کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

(۱) ابواب ۱ تا ۵ میں کتاب کے موضوع (الرعایۃ لحقوق اللہ) کی تشریح کی گئی ہے اور محاسبۂ نفس کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مصنفؒ نے بجا طور پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ نفسِ امّارہ ہر وقت ہر شخص کو ہر پہلو سے دھوکے اور فریب میں مبتلا کرتا رہتا ہے پس جب تک ایک شخص ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرتا رہے وہ نہ احکام الٰہی پر عمل کر سکتا ہے نہ حقوق اللہ کی رعایت کر سکتا ہے نہ اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) باب ششم میں توّابین (توبہ کرنے والوں) کے طبقات کی صراحت کی گئی ہے اور توبہ کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

(۳) باب ہفتم میں موت کی تیاری (استعداد للموت) کا بیان ہے یعنی سالک کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اُس یقینی سفر کے لئے کچھ زادِ راہ پہلے سے تیار (مہیا) کرلے جس سے کسی کو مفر یا چھٹکارا نہیں ہے۔

(۴) ابواب ہشتم تا سیزدہم میں ریا کی مختلف صورتوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے ازالے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ مصنفؒ نے ریا کی مذمّت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے کہ ریا سالک کے اعمال کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح گھُن لکڑی کو، اس لیے اسے اس مرض سے بچنا بچانا چاہیئے۔

باب چہار دہم میں اخلاص کی افادیت اہمیت اور ضرورت کو واضح کیا ہے اور یہ نکتہ ذہن نشین کیا ہے کہ یہ خوبی، ریا کے لیے بمنزلہ تریاق ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص شیوۂ اخلاص کو مدارِ حیات بنالے تو پھر ریا کی طرف مائل بھی نہیں ہوسکے گا اور اس طرح اس مہلک مرض سے محفوظ رہے گا۔

باب پانزدہم اور شانزدہم میں شیطان سے حذر اور اجتناب کے طریقے بیان کئے ہیں یہ ابواب اس قدر قیمتی ہیں کہ امام غزالیؒ نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے بلکہ ابو طالب مکی نے بھی بعض نکات کو اپنی تصنیف قوت القلوب میں درج کیا ہے۔

ابواب ہفدہم تا نوزدہم میں ریاء کے مراتب بیان کئے ہیں۔ مصنفؒ کی نگاہ میں ریاء کی مضرتوں سے اجتناب اس قدر ضروری ہے کہ انہوں نے اس موضوع کے لیے پانچ ابواب وقف کئے۔

ابواب بستم تا بست سوم میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ہم خلوص کے ساتھ خدا کے احکام کی اطاعت صرف اسے خوش کرنے کے لیے کس طرح کرسکتے ہیں جس میں ذاتی غرض یا اجر و معاوضے کا تصور نہ ہو۔ ایک محبت الٰہی اپنی غرض مثلاً حصول جنت کے لیے ہوتی ہے لیکن ایک محبت وہ ہے جو اللہ سے محض اللہ کے لیے کی جاتی ہے اور صوفی کا مقصود یہی پاکیزہ اور خالص محبت ہے جس میں ذاتی اغراض کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

ابواب بست و چہارم تا بست و ہفتم میں نیت کی تشریح کی ہے، اور اس حدیث کا مفہوم واضح کیا ہے کہ "انما الاعمال بالنیات"

باب بست و ہشتم میں ندامت کا بیان کیا ہے۔ جب سالک کسی غلط ارادے کے تحت کوئی کام کرتا ہے تو اسے بعد ازاں ندامت کا احساس ہوتا ہے۔

ابواب بست و نہم تا چہل و ہشتم میں اعمال سے بحث کی ہے خصوصاً یہ کہ دوسروں کے ساتھ ہمارا طرز عمل کیسا ہو؟ نیز یہ کہ اعمالِ حسنہ اعلانیہ بہتر ہیں یا خفیہ؟ نیز یہ کہ خدا سے قطع نظر کرنے کے بعد اعمال پر مخلوق کی مدح یا خدمت سے کس حد تک متاثر ہونا چاہیئے بلکہ خود ہمارا زاویہ نگاہ کیا ہونا چاہیئے؟

ابواب چہل و نہم تا پنجاہ و سوم میں انہوں نے ریاء کے بعد دوسرے مہلک مرض عجب کا بیان کیا ہے جس میں ایک عالم گرفتار ہے اور جو شخص جتنا بڑا عالم ہے اس کے لیے اسی قدر اس مرض میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ابواب پنجاہ و چہارم تا ششم میں کبر کی برائیاں بیان کی ہیں۔ مصنفؒ نے ان تینوں امراض (ریاء، عجب اور تکبر) کی تشخیص اور ان کے ازالے کی تجویز میں اپنے طبیب حاذق بلکہ جالینوس ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اور چونکہ اُن کے زمانے میں بھی یہ امراض علماء، حکماء، عقلاء، فقہاء اور صوفیہ کے طبقوں میں عام تھے اس لیے ان کی نشاندہی میں اکثر حضرات کو اپنی باطنی تصویر نظر آ گئی اور اپنی اصلاح کے بجائے معالج کو ہدف ملامت بنالیا جس طرح زنگی نے اپنی صورت دیکھنے کے بعد سارا غصہ آئینے پر اتار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنازے کے ساتھ صرف چار آدمی تھے۔ سچ بولنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک ہوا ہے۔

باب پنجاہ و ہفتم میں تواضع کو ان امراض کے ازالے کے لیے بطور تریاق پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجاہ و ہشتم و نہم میں اُس فریب نفس کا بیان کیا جس میں ایک انسان، بضمن تعلق باللہ، مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ فریب شیطان کا وہ خاص حربہ ہے جس کی بدولت وہ اکثر انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ مصنفؒ نے اس اہم بحث کو قرآن حکیم کی ان دو آیتوں پر مبنی کیا ہے

(ا) فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ط پس ایسا نہ ہو کہ دنیا کی یہ زندگی تمہیں دھوکے میں ڈال دے اور نہ ایسا ہو کہ وہ بڑا دھوکہ باز (شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کر دے (۳۱-۳۳)

(ب) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ط (۳-۱۸۲) اور نہیں ہے دنیا کی یہ زندگی مگر دھوکے کی پونجی۔

باب شصتم میں حسد کی برائیاں واضح کی ہیں اور اس عیب سے بچنے کے طریقے بیان کئے ہیں۔

باب شصت و یکم میں سالک کے لیے نظام الاوقات مرتب کیا ہے جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور اپنے خالق کی مرضی پر چل سکتا ہے، جو اس کا مقصد حیات ہے۔ آخری باب میں اصلاح نفس، ضبط نفس اور تزکیۂ نفس کی ضرورت کو واضح کیا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو خدا کی خدمت کے لیے تیار کر سکے۔ ایک اعتبار سے یعنی تصوف کے زاویۂ نگاہ سے یہ باب ساری کتاب کا خلاصہ بھی ہے اور تصوف کی روح بھی۔

اقتباس از تذکرہ المحاسبی
در نفحات الانس و کشف المحجوب

شیخ ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں اور عارف جامیؒ نے نفحات الانس میں جو کچھ لکھا ہے

اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

جامی رقمطراز ہیں کہ المحاسبیؒ کا شمار طبقۂ اولیٰ میں ہے وہ جامع علوم ظاہر و علوم اصول و معاملات و اشارات ہیں اہل بغداد کے استاد ہیں ۔ صاحب تصانیف مشائخ میں سے ہیں فرماتے ہیں " جس نے مراقبہ اور اخلاص کی بدولت اپنے باطن کو صحیح کر لیا ، اللہ تعالےٰ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباعِ سنتِ نبویؐ سے مزیّن کر دیتا ہے " نیز فرماتے ہیں " جو شخص اپنے نفس کو ریاضت کی مدد سے مہذّب نہیں کرتا اس پر مقامات کا راستہ نہیں کھولا جاتا " نیز فرمایا " صفت عبودیت یہ ہے کہ تو اپنے نفس کو کسی شئے کا مالک نہ سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ تو اپنے نفس کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں " (نفحات الانس صہ ۵۰ - ۵۱)

شیخ ہجویری کہتے ہیں :-

المحاسبی عالم اصول و فروع تھے اور اپنے زمانے میں اہل علم کے پیشوا تھے ۔ انہوں نے اصول تصوف میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام رعایۃ ہے ۔ اس کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ وہ ہر فن میں عالی حال اور بزرگ ہمّت تھے اور اپنے وقت میں بغداد کے شیخ المشائخ تھے ۔

چونکہ اس تالیف میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ تصوف کی تمام کتابوں کو از اوّل تا آخر درج کیا جائے اس لیے ہم کتاب الرعایۃ کے صرف ایک باب (یعنی باب پنجاہ و چہارم) کا ترجمہ درج کرتے ہیں جس میں کبر سے بحث کی گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس باب سے قارئین کو پوری کتاب کا اندازہ ہو جائے گا ۔ وما توفیقی الا باللہ

کتاب الرعایۃ کا اجمالی تعارف

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ تصوف پر جس قدر کتابیں آج مطبوعہ صورت میں دستیاب ہو سکتی ہیں ، یہ اُن سب میں قدیم ترین ہے ۔ مصنف کا انتقال ۲۴۳ھ میں ہوا ۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنی وفات سے بیس پچیس سال پہلے لکھی ہو گی جب ان کی جسمانی صحت بہت اچھی ہو گی ۔ کیونکہ ضعیفی کے عالم میں اس قدر ضخیم اور بلند پایہ کتاب بمشکل ہی لکھی جا سکتی ہے ۔ بہر حال اس کی تصنیف کا زمانہ ۲۲۰ھ اور ۲۴۳ھ کے درمیان قرار دیا جا سکتا ہے ۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ ابتدائی زمانے میں اسلامی تصوف ،